کالر بلائنڈ
انور قمر

کلر بلائنڈ

کلر بلائنڈ

(افسانے)

انور قمر

قلم پبلی کیشنز بمبئی

COLOUR - BLIND

(URDU SHORT STORIES)

ANWAR QAMAR

TITLE PRADEEP SATHE

FIRST EDITION - DEC 1990

PRICE - RS. 30

نام کتاب : کلر بلائنڈ (افسانے)

مصنف : انور قمر

سرورق کے مصوّر : پردیپ ساٹھے

اشاعتِ اول : دسمبر سنہ ۱۹۹۰ء

تعداد : پانچ سو (۵۰۰)

زیرِ اہتمام : الیاس شوقی

ناشر : قلم پبلی کیشنز

قیمت : ۳۰ روپے

تقسیم کار : قلم پبلی کیشنز، ۷۰، باپو کھوٹے اسٹریٹ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، بمبئی، دہلی، علی گڑھ

مصنّف کا پتہ : ۱۳، اے، گل اپارٹمنٹ، ۲۴۴-بی، سینٹ اینڈریوز روڈ بمبئی ۵۰

اِن افسانوں کے تمام کردار اور واقعات فرضی ہیں۔ کسی شخص یا واقعہ سے ان کا تعلق اگر اتفاق کی بنا پر ہو جائے تو اس صورت میں مصنّف یا پبلشر پر کسی قسم کا الزام عائد کرنا یقیناً ادبی روایات کے منافی ہوگا۔

اشوک پرنٹنگ پریس بمبئی میں طبع ہوئی

قرۃ العین حیدر کے نام
جن کے شب بیدار قلم نے
اردو ادب کو
روشنی عطا کی

فہرست

اپنا بیاں.....

چوں کہ مہابھارت کے یدھ میں تمام کورو مارے جا چکے تھے اور پانچ پانڈوؤں کے سوائے اس فریق کے تمام رفقا ہلاک کر دئے گئے تھے۔ چنانچہ دھرت راشٹر نے سلطنت کی باگ ڈور پانڈوؤں کے حوالے کی اور خود جوگیوں کا لباس پہن کر اپنی بیوی سمیت جنگل کی اور چل پڑا۔ ان کی دیکھا دیکھی پانڈوؤں کی ماں نے بھی جگ تیاگ دینے کا فیصلہ کیا اور وہ بھی ان کے ساتھ ہولی۔ کچھ عرصے بعد یہ تینوں جنگل میں کسی آگ کے اچانک لگ جانے سے جل کر مر گئے۔

ادھر پانڈو راج پاٹ کے کاموں میں مصروف تھے اور مہابھارت کے یدّھ کو تمام ہوئے عرصہ ۳۶ برس کا گزر چکا تھا کہ انھیں اطلاع ملی کہ کرشن پرلوک سدھار چکے ہیں۔ اس اندوہناک خبر کو سن کر ان کا من بھی دنیاداری سے اچاٹ ہوا اور وہ دروپدی کے ساتھ ساتھ اپنے ایک وفادار کتّے کو لے کر سورگ کی کھوج میں ہمالہ کو چل دیے۔ راستے کی صعوبتیں برداشت کرتے کرتے ان کا بھی دم خم نکل گیا اور وہ ایک ایک کر کے یم دوت سے زیر ہوتے گئے۔

ان میں یدھشٹر نے طویل عمر پائی تھی، چنانچہ صرف وہی اپنے کتے سمیت سورگ کے دروازے پر پہنچا۔ اِندر نے اسے حکم دیا کہ وہ سورگ میں داخل ہو جائے لیکن یدھشٹر دہلیز ہی پر کھڑا رہا اور بولا:۔

اے دیوندر! میں اس وقت تک اندر نہیں آؤں گا، جب تک کہ تو میرے

بھائیوں سمیت میری بیوی کو بھی اپنے سورگ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ اِندر نے یدھشٹر کی التجا قبول کی لیکن اس نے سورگ میں کتے کے داخلے پر پابندی لگادی۔ یدھشٹر نے کتے کے بغیر سورگ میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ بس وہ اس کی ایک جھلک دیکھ کر وہاں سے لوٹ گیا۔ دوسرا مقام اس کا دوزخ ہی تھا۔ اور وہی اس کا مقدر تھا۔

دوزخ میں یدھشٹر کو اپنے جملہ عزیزوں اور رفیقوں کو پاکر حیرت ہوئی دوزخ کے عذاب ناقابلِ برداشت تھے اس کے باوجود یدھسٹر وہاں دلی سکون محسوس کر رہا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں کی رفاقت کو سورگ کے لطف و انبساط پر ترجیح دی تھی اور وہ ان کے مصائب و آلام میں اپنی شرکت کو قابلِ شرف سمجھتا تھا۔

مہابھارت یہاں تمام ہوتی ہے۔
میرے یہ افسانے اس رزمیہ کی تضمینِ حال ہیں۔

انور قمر
۱۷ر نومبر ۱۹۹۰ء

کلر بلائنڈ

وہ ایک چھوٹا ساہل اسٹیشن تھا۔ سیزن میں ٹورسٹ جب وہاں پہنچتے تو ہماری بے کیف زندگی میں تھوڑی سی گلابی گھل جاتی، بوجھل فضا تازہ اور جوان ہوجاتی۔ ورنہ وہاں کی ہر چیز سیاہ نم کمبل میں لپٹی ہوئی اُداس مورت تھی۔

میں اُس قصبے میں بسنے والے اُن کم نصیبوں میں سے تھا جو بڑے شہر کی چکراتی ہوئی تیز رفتار زندگی سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر پائے تھے، اور اپنی لاچاری کی بنار پر اس سست رفتار اور کم آباد قصبے میں آکر بس گئے تھے۔

میں تھا اور میرے ساتھ جوان بہن تھی۔ ہم دونوں پولیو زدہ تھے۔

آصف مرچنٹ تھا، جو اپنی تپ دق کی ماری ماں کے علاج کے سلسلے میں اس یقین کے ساتھ یہاں آیا تھا کہ پہاڑوں پر تپ دق کا مریض جلد شفا پا جاتا ہے۔ لیکن اُسے یہاں آئے ہوئے کئی برس ہو چکے تھے،

اُس کی ماں بدستور بیمار تھی ۔ مرض گھٹنے کے بجائے بڑھ گیا تھا۔ مرچنٹ نے اِس دوران میں اپنے گذارے کے لئے قصبے کے واحد اسکول میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ وہ بچّوں کو مصوّری سکھایا کرتا تھا۔

پوچاجی تھے، جنہوں نے فِٹر کی حیثیت سے کسی ڈسٹلیری DISTILLERY میں بڑی عمر گذاری تھی۔ وہاں سے ریٹائر ہو کر اس قصبے میں چلے آئے تھے۔ ڈسٹلیری کے بڑے بڑے بوائلروں کے شور سے ان کی سماعت متاثر ہو چکی تھی، ورنہ ہم سبھوں میں وہ سب سے زیادہ تندرست تھے۔ اپنی صحت کے تعلق سے وہ بڑی احتیاط برتا کرتے تھے، اسی احتیاط کے پیشِ نظر سال کے بارہ مہینے وہ گرم موزے اور گرم دستانے پہنا کرتے تھے۔

مسز جوشی تھیں، جن کے پتی کا دیہانت ہو چکا تھا۔ وہ گھر گھر جاکر اخبار اور رسالے فروخت کیا کرتی تھیں، اور اپنے فرصت کے اوقات میں سوئٹر بُنا کرتی تھیں۔

ایک شاہ صاحب تھے، جنہیں کثرت شراب نوشی کی لت نے تباہ کر دیا تھا۔ اُن کا جگر متاثر ہو چکا تھا۔ وہ چند برس قبل اپنی صحت کی بحالی کی غرض سے یہاں آئے تھے اور اِسی قصبے کے ہو رہے تھے۔ اُن کا ماہانہ خرچ کسی شہر سے اُن کی بیٹی اُنہیں پابندی سے بھیج دیا کرتی تھی۔

شاہ صاحب، پوچاجی، مسز جوشی، آصف مرچنٹ، مَیں اور میری بہن ایک دوسرے کے رفیق اور رازداں تھے، ایک دوسرے کے

عزیز اور غم خوار تھے۔ اِس کے باوجود کوئی قدر ہم میں مشترک نہ تھی، سوائے ایک قدر کے! کوئی شوق یکساں نہ تھا، سوائے ایک شوق کے! اور وہ یہ کہ ہم سبھوں کو رنگ بہت عزیز تھے۔ ہرے، پیلے، اودے، نارنجی، سُرخ۔ سفید اور سیاہ رنگ۔

ہم جب بھی کوئی خوش رنگ چیز دیکھتے، تو بڑا تسکین بخش احساس پیدا ہوتا ہمارے دل میں! ایسا احساس کہ جو ہمارے ذہنی انتشار کو ختم کر دیتا اور ہماری روحوں کو سیراب کر دیتا تھا ہم نے ایک کلر بینک COLOUR BANK قائم کر رکھا تھا، جس میں مختلف رنگوں کی چھوٹی چھوٹی چیزیں، ایسی چیزیں کہ جن کی نظر عامہ میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وقتاً فوقتاً ہم اس بینک میں جمع کیا کرتے تھے۔ جیسے!

خوش رنگ قلم، خوش رنگ پنسلیں، خوش رنگ بٹن، خوش رنگ چوڑیاں، خوش رنگ دستیاں، خوش رنگ اسٹیمپ، خوش رنگ پوسٹ کارڈ اور پرندوں کے خوش رنگ پر۔

میں اپنے اور اپنی بہن کے گذر بسر کی خاطر اس قصبے میں چشمے کی دوکان کرتا تھا۔ دوکان کے بالائی حصے میں ہماری رہائش تھی۔ مجھے اور میری بہن کو نیچے سے اوپر پہنچنے میں بڑی دشواری پیش آتی تھی۔ کیونکہ جب تک ہم جائنٹ بوٹ GIANT BOOT نہیں پہن لیتے تھے، تب تک چل پھر نہیں سکتے تھے۔ پھر جائنٹ بوٹوں کو پہن کر سیڑھیوں کی پیمائش ؟ یقیناً سہل نہ تھی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کھٹا کھٹ کھٹ کھٹ

کی بے ہنگم سی آواز پیدا ہوتی اور یہ آواز اندھیرے میں بستی والوں کو بڑی پُراسرار معلوم ہوتی تھی۔

دوکان کے مقابل، لیکن قدرے فاصلے پر لکڑی کی بنی ہوئی ایک خوش نما عمارت تھی۔ ایسی عمارت کہ جس کا نمونہ ہر بچے کو اُس کے بزرگ اس کے بچپن میں، تحفے میں دیتے ہیں۔ اور ہر بچہ اپنے بچپن سے بڑھاپے تک اُس عمارت کی تشکیل اور تعمیر اپنے ذہن میں کرتا رہتا ہے۔ ٹھیک ایسی ہی عمارت تھی وہ!

اُس عمارت کی ایک اور خصوصیت تھی، اور وہ یہ کہ اُس کے دروازوں کھڑکیوں، قوسوں، محرابوں اور حاشیوں پر رنگ برنگے کانچ نصب تھے۔ اَن گنت رنگین کانچ!

سورج کی کرنیں جب اُن کانچوں پر پڑتیں تو آنکھوں کے سامنے دھنک سی کھل اٹھتی، سارا عالم گلزار ہو جاتا! یہی کیفیت چاندنی رات میں ہوا کرتی تھی۔ دیکھنے والا اُس عمارت کو ایک رنگین خواب تعبیر کرتا۔ ایسا خواب کہ جس کا ہر منظر باغ و بہار تھا۔

عمارت کا حدود دوارلعبہ کافی وسیع تھا۔ اس میں کئی دیوان خانے ہوں گے، کئی زنان خانے، متعدد دالان اور متعدد خواب گاہیں، غلام گردشیں بھی کئی ہوں گی اور برآمدے بھی کئی ہوں گے۔ ملازمین کی تعداد بھی خاصی ہوگی۔ اُن تمام ملازمین کا تقرّر کسی بڑے شہر میں ہوا کرتا ہوگا اور وہ کسی خفیہ ذریعہ سے اس عمارت میں پہنچائے جاتے ہوں گے اور اُسی

خفیہ ذریعہ سے واپس لے جائے جاتے ہوں گے ۔ کیونکہ یہ بھی تعجب خیز امر تھا کہ اُن میں سے کوئی بھولا بھٹکا ملازم ہم سے آکر کبھی نہیں مِلا تھا ۔

سال میں دو ایک مرتبہ کوئی خاتون اُس عمارت میں آکر ٹھہرا کرتی تھی ۔ اُس کے آتے ہی قصبے میں پُرخوف خاموشی چھا جاتی تھی ۔ ایسی خاموشی کہ مجھے عینکوں کے کانچ گھِسنے کی مشین چلانے میں ڈر سا محسوس ہوتا تھا ۔ اِسی ڈر سے اُن دنوں ہم اپنے جائنٹ بوٹوں پر ٹاٹ کا موٹا غلاف چڑھا لیتے تھے تاکہ سیڑھیاں چڑھتے اور اُترتے میں کھٹ، کھٹ کھٹ کی وہ ناگوار آواز نہ ہو ۔ یہ اور بات ہے کہ اِس صورت میں ہم دونوں بھائی بہن کا چلنا پھرنا دوبھر ہو جاتا تھا ۔

یوں تو ہفتے میں دو ایک بار آصف مرچنٹ ، پوچاجی ، مسز جوشی اور شاہ صاحب میری دوکان پر شام کے وقت ضرور آتے اور ڈھلتے سورج کے پس منظر میں اُس خوشنما عمارت کے حسن و جمال کا لطف لیتے تھے ۔ لیکن جن دنوں وہ خاتون اُس عمارت میں آکر ٹھہرتی ، اُن دنوں میں میرے دوست ہر شام میرے یہاں بلاناغہ حاضری دیتے تھے ۔

میری بہن بڑی لطیف اور خوشگوار چائے بنا کر انھیں پلاتی میں کوئی ہلکا پھلکا کام ہاتھ میں لے لیتا اور اُن کی گفتگو میں باقاعدہ شریک ہوتا تھا ۔

مرچنٹ ، پوچاجی ، مسز جوشی اور شاہ صاحب کی تمنا ہوتی کہ کسی صورت اُس خاتون کے درشن کرلیں ۔ لیکن یہ ممکن ہی نہ تھا ۔ اسکی بہتیری وجہیں تھیں؛

اول، میری دوکان اور اُس عمارت کے درمیان میں ڈیڑھ دو فرلانگ کا فاصلہ تھا۔

دوم، عمارت کے باہر بھاری پہرہ تھا۔

سوم، داخلے کا پروانہ ہم میں سے کسی کے پاس نہ تھا۔ اگر ہوتا بھی تو ہم عمارت میں داخل نہ ہو سکتے تھے۔ کیونکہ اُس عمارت کے ضابطے، اُس کی ترتیب، اس کی آراستگی اور اُس کی چوکسی اُس خاتون کی موجودگی میں ہمیں بہت زیادہ خوفزدہ کر دیا کرتی تھی۔

چائے کی چسکی لیتے ہوئے مرچنٹ پوچھتا "تم نے اُسے دیکھا؟"

"نہیں" میں جواب دیتا۔

"نہیں" میری بہن گردن ہلا کر کہتی۔

"نہیں" مسز جوشی کا جواب ہوتا۔

"ہم میں سے کسی نے بھی نہیں" شاہ صاحب کہتے۔

پوچاجی خاموش رہتے۔

"کہاں سے آتی ہے؟ کہاں کو جاتی ہے؟" مرچنٹ دونوں سوال اکٹھے پوچھتا۔

"ہم سب "ہمیں نہیں معلوم، ہمیں نہیں معلوم" کی گردان کرتے پوچاجی حسب معمول خاموش رہتے۔ پھر وہ یک لخت بول اُٹھتے:

"ایک نہ ایک دن اُس کا دیدار ضرور نصیب ہوگا، ایک نہ ایک دن اُس کا دیدار ضرور نصیب ہوگا"

ہم سبھوں کے منہ سے نکلتا "آمین، آمین"

اُس رات میں بستر پر بیٹھا اپنے ناتواں پیروں کو اپنے ہاتھوں سے داب رہا تھا کہ میں نے دیکھا، چاند بہتے بہتے میری کھڑکی میں تھم سا گیا ہے اور چاندنی میں وہ عمارت اُس خوش رنگ پرندے کی مانند لگ رہی ہے جو دونوں پر کھولے آسمانوں کی جانب گردن اُٹھائے خدا کی حمد و ثنا کر رہا ہو۔ میرا جی چاہا کہ اُسے وہاں سے اُٹھا کر اپنے پہلو میں لے آؤں اور اس کے ایک ایک حصّہ پر ہولے ہولے اپنی انگلیاں یوں پھیروں کہ اس کا سحر انگیز حُسن میرے لمس میں محفوظ ہو جائے۔

ابھی میں اِسی خیال سے لُطف اندوز ہو رہا تھا کہ مجھے عمارت کے نیم روشن برآمدے میں ایک سایہ سا نظر آیا، میں نے آنکھیں ملیں اور اُس نقطے پر جہاں وہ سایہ نظر آیا تھا اپنی نظر فوکس کر دی۔ اِن چند ثانیوں میں چاند پر سیاہ بادل کا پردہ پڑ چکا تھا، جس کے نیتجے میں وہ سایہ نظر سے اوجھل تھا۔ میں نے بستر سے اُٹھ کر صندوق میں سے دوربین نکالی اور دوربین کی مدد سے اس سایہ کو اُس نیم روشن برآمدے میں تلاش کرنے لگا۔ بادل ہٹ چکا تھا۔ چاندنی حسب سابق عمارت پر پڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک وجیہہ اور پُر وقار عورت برآمدے میں ٹہل رہی ہے اُس کی زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی ہیں، اور وہ کسی دکھی سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اگلے روز میں نے رات کی ساری تفصیل اپنے ساتھیوں سے بیان کر دی۔ انہوں نے پوری توجہ اور استعجاب کے ساتھ میری باتیں

سُنیں اور شام کے بجائے رات کو میرے گھر آنے کا پروگرام بنایا۔ جب پوچا جی کے کانوں کے قریب منہ لے جاکر مرچنٹ نے انہیں ساری روداد سنائی تو اُنہوں نے کہا:

"آج صبح سیر کرتے کرتے اپنے معمول کے مطابق جب میں وینس پوائنٹ پہنچا تو میرے کانوں میں کوئی غیر مانوس آواز ایسی پڑی کہ گویا ٹٹّے پھُدک رہے ہوں۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک عورت رائڈینگ سوٹ پہنے امیرانہ شان سے شہسواری کرتی چلی جارہی ہے، اور اس سے کچھ فاصلے پر آٹھ دس گھُڑ سوار اُس کے پیچھے پیچھے چلے جارہے ہیں۔"

ہم نے سوچا کہ وہ گھُڑ سوار عورت یقیناً وہ خاتون ہوگی کہ جس کے دیدار کو ہم ترس رہے ہیں۔

میری بہن نے پوچھا "اس کا رُخ کس طرف کو تھا؟"

پوچا جی بولے "خاموش وادی کی طرف۔"

اگلے روز علی الصبح ہم سب سردی سے ٹھٹھرتے خاموش وادی میں پہنچ گئے۔ پَو پھٹ چکی تھی۔ آسمان کی سیاہی میں سُرخی تیزی سے سرایت کرتی جارہی تھی۔ فضا میں شورہ آمیز بُو بسی ہوئی تھی۔ اور چاروں طرف ایک ناقابلِ فہم افسردہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ انتظار کرتے کرتے جب کافی وقت گذر چکا، یہاں تک کہ سورج بھی اونچا اُٹھ آیا، تو ہم نے پوچا جی سے پوچھا:

"پوچاجی، آپ کے کہنے پر ہم یہاں چلے آئے، یہاں، اِس ویرانے میں! وہ عورت ہمیں کہیں دکھائی نہیں دیتی؟ کہاں ہے وہ؟ اور کہاں ہیں وہ گھُڑ سوار؟"

پوچاجی نے خلافِ توقع دیوانوں کی طرح دونوں ہاتھ ہوا میں یوں لہرائے گویا اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہے ہوں۔

جب ہم خاموش وادی سے قصبے کی جانب چلے تو راہ میں میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا:

"آخر ہم کیوں اُس کے دیدار کے متمنّی ہیں؟ ہمیں کیا پڑی ہے کہ اس کی صورت دیکھنے کے لئے اتنے کشٹ اٹھائیں؟ رات کی نیند اور دِن کا چین حرام کر دیا ہے ہم نے اپنے آپ پر! آخر کوئی تو وجہ ہو؟"

مرچنٹ نے کہا "وجہ ہے، اور بڑی معقول وجہ ہے۔ سنو، یہ ہمارے دیش کی روایت رہی ہے صدیوں سے عوام اپنے راجا کے درشن کرتے چلے آ رہے ہیں۔"

"آخر کیوں؟" شاہ صاحب نے پوچھا۔

آصف مرچنٹ نے پھر جواب دیا: "اس لئے کہ راجا کا درشن عوام کے حق میں مبارک اور باعثِ برکت سمجھا جاتا ہے۔ پرانے محلوں میں "درشن جھروکے" ہوا کرتے تھے۔ طلوع آفتاب کے بعد راجا اُس جھروکے سے، دور اور نزدیک سے آئے ہوئے اپنے عوام کو درشن دیا کرتا تھا۔ راجا کے درشن کو لینے کے بعد عوام راجا کی جے، جے، کرتے

"خوشی خوشی اپنے کھیتوں، کارخانوں اور دھندوں پر چلے جایا کرتے تھے، اُن کا اعتقاد تھا کہ راجا کے درشن سے اُن کا نصیبہ جاگ اُٹھے گا، اُن کی کٹھنائیاں دور ہوں گی اور ناسازگار حالات درست ہو جائیں گے۔"

مسز جوشی بولیں" لیکن اس بات کا ہم سے کیا تعلق ہے؟"

"تعلق ہے، یقیناً ہے۔ ہم سب ایک انتہائی سُست سی بلکہ بیمار سی زندگی گزار رہے ہیں۔ سیکڑوں دن اور سیکڑوں راتیں ہماری عمر سے کٹ چکی ہیں۔ ہمارے جیون میں نہ تو کوئی لہر اُٹھتی ہے اور نہ ہی کوئی جھونکا آتا ہے۔ یہاں تک کہ رحمت بھی نہیں برستی، اور نہ کوئی زمین لالہ زار ہوتی ہے۔ ہم ایک حیرتناک مایوسی اور افسردگی کا بوجھ لئے بوڑھے جذامیوں کی طرح ایک اندھی سرنگ سے گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ ایسے مایوس کن حالات میں اُس خاتون کے دیدار کی تمنّا نہ صرف بامقصد ہے بلکہ بامعنی بھی ہے ممکن ہے اس کا دیدار ہمارے لئے مُبارک ثابت ہو اور ہماری کایا پلٹ جائے۔" یہ کہہ کر آصف مرچنٹ خاموش ہو گیا۔

مجھے پل بھر کے لئے اپنے جوتے بے حد وزنی اور اپنا وجود من من بھر بھاری محسوس ہونے لگا۔

ہم اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ وہ ہمارے لئے بدستور ایک معمہ بنی ہوئی تھی۔ ہم اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ کہاں سے آتی تھی؟ وہ کہاں کو جاتی تھی؟ اِس عمارت میں کیوں ٹھہرا کرتی تھی؟ یہ عمارت بذاتِ خود بھول بھلیاں تھی! گویا یہ ایک کھوج ہو کوئی گورکھ

دھندا ہو، جس کا سرا کسی منتر کے اندر پوشیدہ ہو۔ عمارت کا تحفظ، اُس کے حسن کا تحفظ، ایک چکرا دینے والی پہیلی تھی۔ اس کے کئی پہلو مخفی ہوتے ہوئے بھی نمایاں تھے ظاہر ہوتے بھی پوشیدہ تھے۔ وہ ہمارے لئے ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی جسے حل کرنے میں ہم کوشاں تھے۔

اُس شام، آصف مرچنٹ، مسز جوشی، پوچاجی اور شاہ صاحب حسب معمول دوکان پر موجود تھے اور ہم سب مل کر ایک حیرت ناک منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ منظر یہ تھا کہ ایڈورڈ جونس کا بینڈ اس عمارت کے سامنے پُرسوز دُھنیں بکھیر رہا تھا، اور یہ دُھنیں رفتہ رفتہ ہمیں سوگوار کرتی چلی جا رہی تھیں۔

اُس رات ہم سب ایڈورڈ جونس کے گھر پہنچے۔ ایڈورڈ جونس اس قصبے میں برسہا برس سے رہ رہا تھا اُس کا پیتل کے باجے بجانے والوں کا طائفہ تھا۔ وہ اپنی روزی روٹی اسی پیشے سے کماتا تھا۔ یوں بھی وہ بڑا خداترس اور نیک دِل انسان تھا۔ اپنے مذہب کی تبلیغ اس کا نصب العین اور مشغلہ تھا۔ اس کی تبلیغ کا ڈھنگ نرالا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں پھیری کرتا اور مقامی زبانوں میں چھپی ہوئی مقدس انجیل اور دیگر مذہبی کتابیں لوگوں کو بیچتا یا بانٹ دیا کرتا تھا۔ مشنریوں میں وہ EDWARD JONES THE GREAT COLPORTEUR کے نام سے مشہور تھا۔

ابھی رات کے نو ہی بجے تھے۔ لیکن ایڈورڈ جونس اپنی سحر خیزی کی عادت کی وجہ سے سو چکا تھا۔ ہمارے دروازہ کھٹکھٹانے پر وہ جاگا۔

لالٹین جلائی اور پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ جب ہم سب اس کے قدرے کشادہ مکان میں اطمینان سے بیٹھ گئے، تو میں نے گفتگو کا آغاز کیا:

"ایڈورڈ جونس اس وقت آنے پر ہم شرمندہ ہیں اور تمہیں زحمت دینے پر نادم ہیں، لیکن ہماری مجبوری اس سے سوا ہے۔"

جونس کے چہرے پر کوئی ناخوشگوار تاثر پہلے بھی نہ تھا لیکن میری بات سُن کر وہ زیرِ لب مسکرایا اور بولا:

"ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے کسی قسم کی زحمت نہیں ہوئی۔ آپ ناحق پریشان نہ ہوں۔ وہ بات بلا تکلف بتائیں جس کے لئے آپ تشریف لائے ہیں۔"

"جونس، ہم جاننا چاہتے ہیں کہ آج اُس عمارت کے سامنے تم نے بینڈ کیوں بجایا؟"

ایڈورڈ جونس بولا:

"اس عمارت سے مجھے ایک دستی خط ملا، اُس میں لکھا تھا کہ آج شام میں وہاں پہنچوں اور آدھے گھنٹے تک پلینٹ کمپوزیشن PLAINT COMPOSITION بجاؤں۔ مجھے اس خط میں یہ ہدایت بھی دی گئی تھی کہ میں اُس چٹھی رساں کو اپنی فیس سے آگاہ کر دوں تاکہ وہ فیس شام میں مجھے ادا کی جا سکے۔"

"تم نے کتنی بتائی؟" شاہ صاحب نے پوچھا

"میں نے اس سے کہا کہ فیس کی کوئی اہمیت نہیں ہے میرے نزدیک۔ جو سمجھ میں آئے دیدیں۔ میں خوشی سے قبول کر لوں گا۔ وہاں پہنچا تو

"عمارت کے سامنے ٹیبل کرسیاں بچھی ہوئیں تھیں اور مرکزی ٹیبل پر یہ لفافہ رکھا ہوا تھا۔ جونس نے کتابوں کے شِلف پر رکھا ہوا ایک لفافہ اٹھایا اور ہماری طرف بڑھا دیا۔ ہم سبھوں نے اس لفافے کو خوب اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ دبیز کاغذ کا بنا ہوا سفید رنگ کا لفافہ تھا جو شہر کی کسی بھی اسٹیشنری کی دوکان سے دستیاب ہو سکتا تھا۔ لفافے کے اندر سو سو روپے کے دو کرارے نوٹ رکھے ہوئے تھے۔

"صرف دو سو؟" پوچا جی نے حیرت سے یوں پوچھا۔ گویا یہ رقم اس عمارت میں رہنے والوں کی جانب سے ادائیگی کے شایانِ شان نہ تھی۔

"نہیں، انھوں نے ایک ہزار کی رقم دی تھی میں نے دو دو سو روپے کی رقم اپنے چار ساتھیوں میں تقسیم کر دی۔"

میری بہن نے پوچھا "جونس ہمیں بتاؤ کہ تم نے کس طرز کی دُھنیں وہاں بجائیں؟ ظاہر ہے ان کا تاثر بڑا سوگوار تھا۔"

جونس نے میری بہن کے ناتواں پیروں پر نظر ڈالی اور بولا:

"جی ہاں! وہ ماتمی دُھنیں تھیں" PLAINT COMPOSITIONS

"جونس ہمیں بتاؤ کہ ایسی دُھنیں تم کس موقع پر بجاتے ہو؟"

"جب کسی کو ضرر پہنچے، کسی کا کچھ کھو جائے، کچھ ضائع ہو جائے۔"

"ضرر پہنچنے، ضائع ہو جانے اور کھو جانے سے ہم کیا مراد لیں؟"

پوچا جی جو کان سے ہاتھ لگائے ہماری باتیں سُن رہے تھے بولے۔

ایڈورڈ جونس نے مضطرب ہو کر کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ موت۔"

"مسز جوشی نے کہا" جیسے میرے پتی کی موت، مسٹر جوشی کی ؟"

"جی، درست ہے، بالکل درست ۔"

" ایڈورڈ جونس میرے پتی کی موت پر تم نے ماتمی دُھنیں کیوں نہیں بجائیں ؟ کیا تمہارے نزدیک یہ کوئی لاس LOSS, نہیں تھا ؟"

میری بہن نے اپنی ساری کا سرا اپنے ٹخنوں تک اٹھایا اور بولی "ایڈورڈ جونس یہ میرے پیر ہیں، اور یہ میرے بھائی کے ۔" اس نے میری پتلون کا نچلا سرا میرے ٹخنوں تک اٹھایا اور بولی " ہم گوشت پوست کے بنے ہوئے تھے، ہماری قسمت نے ہم سے مذاق کیا۔ اس نے ہم سے گوشت پوست کے پیر چھین لئے اور ہمیں ساگوان کی لکڑی اور بھینس کے چمڑے کے بنے ہوئے پیر عطا کئے۔ کیا یہ ہمارا نقصان نہیں ؟ ایڈورڈ جونس تم نے اس سلسلے میں کوئی ماتمی دُھن کیوں نہیں بجائی ؟"

آصف مرچنٹ نے کہا" میری ماں کے سینے میں پھیپھڑے نہیں رہے ہیں جونس ! اگر پھیپھڑے ہوتے تو ہوا پھینکتے اب تو ان کی ذرا سی جنبش سے میری ماں کے منہ سے خون رسنے لگتا ہے۔ایڈورڈ جونس ! کیا تمہارے نزدیک یہ قابلِ افسوس بات نہیں ؟ اگر ہے تو پھر تم نے کیوں ہمیں اور ہمارے نقصان کو نظر انداز کیا ؟ کبھی بھولے بھٹکے بھی نہیں آئے۔ ہمارے درمیان بھی نہیں بیٹھے ۔ ہمارا حال تک نہیں پوچھا ہمارا درد بھی نہیں بانٹا ۔ تم پر ہمارا بہت بڑا قرض ہے ایڈورڈ جونس ۔"

پھر ہم وہاں سے چل دیئے ۔ کہیں دور، کسی ویرانے میں کوئی بڑھیا

دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور اس کے رونے کی آواز ہمارے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔

اگلے روز ایک اجنبی میرے یہاں پہنچا، اس کے ہاتھ میں ٹھیک اسی نمونے کا لفافہ تھا کہ جس نمونے کا لفافہ ہم نے ایڈورڈ جونس کے یہاں کل رات کو دیکھا تھا۔ وہ لفافہ اس شخص نے میری طرف بڑھا دیا لفافے پر نام لکھا ہوا دیکھ کر ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑ گئی میرے جسم میں! لرزتے ہاتھوں سے میں نے لفافہ چاک کیا۔ اس میں ایک ٹائپ شدہ رقعہ تھا جس میں لکھا تھا:

"چونکہ اس قصبے میں کوئی ماہر چشم نہیں ہے اور ہمیں ایک کیس کے سلسلے میں فوری طور پر مشورہ کرنا ہے اس لئے براہِ کرم پہلی فرصت میں تشریف لائیں۔"

جی میں آیا کہہ دوں کہ مجھے فرصت نہیں۔ میں آنکھ کا معالج نہیں ہوں بلکہ چشمہ ساز ہوں۔ شہر پچاس کوس کے فاصلے پر ہے گاڑی بھیج کر کسی ماہر چشم کو بلا لیں۔

لیکن چشمہ سازی کا فن سیکھتے سیکھتے میں آنکھوں کی اندرونی اور بیرونی ساخت، ان کے امراض اور اُن کے علاج، اُن کے نقص اور اُن کو دور کرنے کے طریقے، آنکھوں کو لاحق خطرے اور اُن خطروں سے بچنے کی تدبیریں، بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں پیدا ہونے والی کمزوریاں اور ان کے دفاعی اقدام سے میں واقف تھا۔ میں بغیر کسی آلے کی

مدد کے بتا سکتا تھا کہ موتیا کب پکے گا؟ آدمی شارٹ سائٹیڈ ہے یا لانگ سائٹیڈ؟
آشوب چشم کے سلسلے میں کونسا نسخہ مجرب ہے۔ کونٹکٹ لینس CONTACT LENS
آنکھوں کی بصارت کو تیز کرنے میں کتنے معاون ہیں اور پولورائیڈ لینس
POLAROID LENS کس اصول پر کام کرتے ہیں۔ قطع نظر ان باتوں
کے، عمارت کے اندر کا حال جاننے کا اشتیاق میرے دوسرے خیالوں پر
حاوی رہا۔ میں نے ایک گھنٹے کا وقت طلب کیا اور درخواست بھجوائی کہ
میرے ساتھ میرے رفقاء بھی ہوں گے۔ ان کی موجودگی پر براہِ مہربانی اعتراض
نہ کیا جائے۔ میری بہن نے مسز جوشی، پوچاجی، مرچنٹ اور شاہ صاحب کے
گھر جاکر میرا پیغام پہنچایا کہ عمارت میں داخلے کی سبیل نکل آئی ہے۔ وہ
سب دوکان پر فوراً پہنچیں۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ سب عمدہ لباس پہن کر دوکان پر آپہنچے
اُن کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں! جانچ کے آلے بٹورتے ہوئے نہ
جانے کیوں میرے بھی ہاتھ کانپ رہے تھے! میں نے ڈوبی ہوئی آواز میں
کہا۔ "چلیے،" نڈھال قدموں سے وہ میرے ساتھ عمارت کی جانب روانہ ہوئے
اُس عمارت کے پہرے پر تعینات افسر گویا ہماری آمد سے باخبر تھا۔ ضابطے
کی کارروائی پوری کرنے کی خاطر اس نے وہ رقعہ ہم سے لے لیا، رجسٹر پر ہمارے
ناموں کا اندراج کیا، اُس کے بعد اُس نے فرداً فرداً ہمارے دستخط لئے اور
داخلے کے لئے دروازہ کھول دیا۔

عمارت کے سامنے لان تھا، جس کے حاشیہ پر پختہ راستہ بنا ہوا تھا۔

ہم اُس راستے سے گذرتے ہوئے عمارت کے برآمدے میں پہنچ گئے۔
برآمدے کو عبور کیا اور پھر ایک نہایت آراستہ، پیراستہ دالان میں داخل ہوگئے۔ دالان کی دیواروں پر، راجوں مہاراجوں سے مشابہ دیوار گیر پوٹریٹ PORTRAIT لگے ہوئے تھے۔ اُن کے چہروں سے رجواڑی رُعب داب عیاں تھا۔ اُس دالان سے گذر کر ہم دوسرے دالان میں پہنچے۔ وہاں بھی کوئی موجود نہ تھا۔ البتہ اس کی دیواروں پر جانوروں کے سر نصب تھے اور دالان کے دوسرے سرے پر واقع محراب دار دروازے کے دائیں اور بائیں جانب دو تصویریں آویزاں تھیں!

ایک تصویر اُس پیکر سے مشابہت رکھتی تھی جسے میں نے اس رات دور بین کی مدد سے اس عمارت کے برآمدے میں ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا۔

دوسری تصویر پوچاجی کے بیان کئے ہوئے واقعہ سے ملتی جلتی تھی۔ خاموش وادی کو جاتی ہوئی گھڑ سوار عورت۔ قدرے فاصلے پر اس کے پیچھے پیچھے جاتے ہوئے گھڑ سوار۔ تصویروں کو دیکھتے ہی ہمارے دل دہشت سے لرز اُٹھے۔ اس طویل و عریض کمرے کی ہر ہر چیز پُر اسرار معلوم ہونے لگی۔

ہم اس کمرے سے نکل کر ایک دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کے وسط میں ایک نوجوان بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا، اس کے لبوں میں حقہ کی سنہری نے دبی ہوئی تھی۔ اس کے نتھنوں سے نکلتی ہوئی دھوئیں

کی پتلی سی لکیر فضا میں کُنڈل بنا رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اپنا ذاتی تعارف دینے کے بعد اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا۔ وہ ہم سب سے خندہ پیشانی سے ملا۔ اس کا لہجہ نرم اور آواز دھیمی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے غم جھانک رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"جناب عالی! نہ تو میں ماہر چشم ہوں اور نہ ہی کوئی سرجن، پھر بھی اپنے پیشے کے تیس سالہ تجربہ کی روشنی میں آنکھوں کے امراض کے سلسلے میں مشورے دے سکتا ہوں۔ ویسے آپ لانگ سائیٹیڈ پرسن ہیں کسی وجہ سے آپ نے اپنے لائبریری اسپیکٹس نہیں لگائے ہیں۔ آپ کی آنکھیں دیر تک پڑھ نہیں سکتیں، وہ تھک جاتی ہیں۔"

"خوب! بہت خوب۔" اس نے کہا اور جیکٹ کی جیب میں سے اپنی عینک نکال کر دکھاتے ہوئے بولا۔ "آپ کا فرمانا درست ہے، ویسے میرا نمبر زیادہ نہیں ہے۔"

اس دوران میں خادم چائے کی کشتی تپائی پر رکھ گیا تھا۔ اس نے بڑے اخلاق سے میرے ساتھیوں کو چائے نوش کرنے کی درخواست کی اور مجھے اپنے ساتھ لے کر اگلے کمرے میں چلا آیا۔ اس کمرے میں ایک سات آٹھ سالہ لڑکا صوفے پر لیٹا ہوا کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا، جس کی آنکھوں پر چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ "یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔" اس نے بچّے کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "اسے دو روز سے پڑھتے ہوئے دشواری محسوس ہو رہی ہے۔"

بچے نے مسکرا کر گردن اُٹھائی اور ہلکے سے مجھے ہلو کہا پھر بولا "آپ پولیو کے مریض ہیں ؟"

"جی۔ جی ہاں۔ صاحبزادے۔" میں نے پتہ نہیں کیوں اتنے احترام سے اُسے جواب دیا۔

"آپ کے والدین کم پڑھے لکھے تھے، پرلیو وکسین POLIO VACCINE آپ کے بھی بچپن میں مہیا تھا۔" وہ میری ناتواں ٹانگوں کا جائزہ لینے لگا۔

"پتاجی، آپ انہیں اسٹیٹ کیوں نہیں بھجوادیتے، ان کی ٹانگیں وہاں درست ہوسکتی ہیں!"

"بیٹے یہ ہمارا پرابلم نہیں ہے۔ ذرا اس کرسی پر بیٹھو یہ تمہاری آنکھوں کی جانچ کرنے آئے ہیں۔"

"میری آنکھوں کی؟ مجھے تو کوئی پرابلم نہیں۔"

میں نے اُسے تسلی دی، "صاحبزادے آپ بہت پڑھتے ہیں نا؟"

اس نے اس بات میں گردن ہلائی۔

"زیادہ پڑھنے لکھنے والوں کو اپنی آنکھ کی جانچ سال میں دو ایک بار کروالینی چاہیئے۔ یہ آپ کا روٹین چیک اپ ROUTINE CHECK UP ہے۔ میں آلوں کی مدد سے اس کی آنکھوں کا معائنہ کرنے لگا۔ آٹھ دس منٹ میں معائنہ کر چکا برسبیل تذکرہ پوچھ بیٹھا۔ "صاحبزادے آپ کو کون کون سے رنگ پسند ہیں؟"

"رنگ؟" وہ کچھ سوچتا ہوا بولا۔

"ہاں رنگ، نیلے، پیلے، اودے، سرخ، سبز رنگ۔"

"مجھے ..... مجھے رنگوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"کیا فرمارہے ہیں آپ، صاحبزادے! رنگ تو کائنات میں جاری وساری ہیں۔ سارے عالم میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اُن کے بغیر تو کسی شئے کا تصوّر ہی ممکن نہیں۔"

نوجوان کے چہرے پر تھوڑی سی خفگی کے آثار نمایاں ہوئے، پھر زائل ہوگئے۔ اس نے ذرا تیز لہجے مگر دھیمی آواز میں کہا۔ "آپ اپنا معائنہ مکمل کرچکے ہیں تو چلیں، آپ کے ساتھی آپ کے منتظر ہوں گے۔"

میں نے اُس کے لہجے میں تبدیلی فوراً محسوس کی۔ "جی" میں نے اپنے آلے بیگ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "آپ کے بچے کی آنکھیں پرفیکٹ آرڈر میں ہیں۔ آپ ذرا بھی فکر نہ کریں۔ البتہ شہر جاکر کسی اچھے آپیٹشن سے ان کی نئی عینک بنوالیں۔ ان کا نمبر بدل چکا ہے۔"

جب ہم اُس کمرے کو لوٹنے لگے تو میں نے اس نوجوان سے پوچھا: "آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں۔"

اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "فرمایئے۔"

"کیا آپ کو بھی رنگوں سے کوئی دلچسپی نہیں؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" اس نے متردد ہوکر پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ کی سوچ و فکر پر، آپ کے طرز زندگی پر، آپ کے لائحہ عمل پر، آپ کے نصب العین پر رنگوں کا کوئی عمل دخل ہے

بھی یا نہیں ؟"

اس نے اپنی چال روک دی، کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا!
"پتہ نہیں آپ رنگوں کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں ؟" آخر رنگوں کی حقیقت ہی کیا ہے! یہ ایک خاص احساس ہے جو انتشار شعاع سے آنکھ کی پتلی پر پیدا ہوتا ہے۔ پانی کے ایک قطرے سے سورج کی شعاع گزرتی ہے اور دھنک کی شکل میں سات رنگ بکھیر دیتی ہے۔ سرخ، نیلا اور زرد بنیادی اور اصلی رنگ ہیں۔ باقی کے تمام رنگ انہی تین رنگوں کو مختلف مقدار میں ملانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ بتایئے اب رنگوں کی کیا اہمیت رہ گئی ہے آپ کے نزدیک؟"

"میں نے اس کی معلومات پر حیرت کا اظہار کیا اور بولا۔
"جناب عالی! میں آپ کی بات کی تردید کرنے کی جرائت نہیں کر سکتا۔ لیکن آخری سوال پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

اس نے اکتاہٹ اور بیزارگی سے کہا۔" فرمایئے"

"یہ بتانے کی زحمت کریں کہ جب آپ کو رنگوں سے قطعی دلچسپی نہیں ہے تو رنگوں کے سلسلے میں اتنی معلومات کیوں کر حاصل کر رکھی ہیں آپ نے ؟"

" اس نے ذرا جھجک کر اور سوچ کر جواب دیا" یہ کتابی باتیں ہیں مطالعہ کا شوق مجھے بھی ہے۔"

"جناب عالی! ایک آخری سوال۔"

"آپ نے تنگ کر دیا مجھے۔" اُس نے دُرشت لہجے میں کہا۔

"یہ میرے پیشے سے متعلق سوال ہے، ممکن ہے، آپ کا جواب میری ذہنی گتھی کو سلجھانے میں مددگار ثابت ہو۔" پھر اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا:

"کیا آپ سرخ۔ اور سبز رنگوں میں تمیز کر سکتے ہیں؟"

یہ سنتے ہی اُس کا رنگ اتر گیا اس نے نظریں جھکا لیں اور اندر کے کمرے میں چلا گیا۔

اُس کمرے سے نکل کر ہم اس دالان میں آگئے جس کی دیوار پر اُس خاتون کی وہ تصویریں آویزاں تھیں میری نظریں اچانک پوٹریٹ پر جا پڑیں جیسے کسی مقناطیسی قوت نے انہیں اپنی جانب کھینچ لیا ہو۔ میرے اندر بیٹھے ہوئے اس تجربہ کار چشم شناس نے مجھے اطلاع دی کہ یہ خاتون بھی اُس مرض میں مبتلا تھی کہ جس مرض میں وہ نوجوان مبتلا ہے اور جس مرض میں اُس نوجوان کا بیٹا! کیا مرض موروثی تھا؟

عمارت سے نکلنے سے قبل اُس افسر نے ایک لفافہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ لفافے میں سو سو کے بیس نوٹ رکھے ہوئے تھے اور ایک ٹائپ شدہ عبارت ان سے منسلک تھی:

"معالج اپنے مریض کا سب سے بڑا رازداں ہوتا ہے۔"

"میں نے دوکان پر پہنچ کر اپنے ساتھیوں سے مشورہ طلب کیا کہ آیا مجھے یہ رقم قبول کرنی چاہیئے یا نہیں؟

"کیوں نہیں قبول کرنی چاہیئے۔ یہ تمہاری فیس ہے۔"

"میری فیس؟"

"ہاں تمہاری۔"

"مگر یہ کس کام کی؟" میں نے کیا کیا؟"

"تم نے .... تم نے .... ہاں تم نے ہمیں بتایا ہی نہیں کہ تم نے اندر کس کی جانچ کی، کس کی آنکھوں کا معائنہ کیا؟"

مجھے اُس ٹائپ شدہ عبارت کا خیال آیا: "معالج اپنے مریض کا سب سے بڑا رازداں ہوتا ہے۔" میں نے اپنے ساتھیوں سے سر میں گرانی کا بہانہ کر کے معذرت طلب کی پھر ان کے جانے کے بعد دوکان بند کر کے اوپر کی منزل پر چلا آیا۔

اُس رات بڑی دیر تک مجھے نیند نہیں آئی۔ میں کھڑکی میں بیٹھا اپنی اور اپنی بہن کی، آصف مرچنٹ اور پوچاجی کی، مسز جوشی اور شاہ صاحب کی زندگی کے بارے میں دیر تک غور کرتا رہا۔ ہماری زندگی میں کوئی قدر مشترک نہ تھی سوائے رنگوں کے، ہم رنگ دیکھکر خوش ہو جانے والے لوگ تھے۔

چاند گھٹ گیا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی عمارت کی ہر کانچ میں سے دھنک کی طرح پھوٹ کر بکھر رہی تھی۔

اگلے روز میں نے دیکھا، عمارت سے وہ ست رنگی کانچ نکالے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ دفتے کے ٹکڑے نصب کیے جا رہے ہیں۔

اس شام سبھوں نے چائے پیتے ہوئے میری بہن سے شکایت کی کہ اس نے آج تک اتنی بدمزہ چائے انہیں کبھی نہیں پلائی تھی !

پوچاجی بار بار ناک سُڑک رہے تھے اور دائیں بائیں گردن ہلائے جاتے تھے۔

مسز جوشی اور آصف مرچنٹ، شاہ صاحب اور میری بہن کسی اور مقام پر منتقل ہو جانے کی بات کر رہے تھے۔ جہاں زندگی تیز رفتار نہ ہو، جہاں فضا بوجھل نہ ہو، جہاں لکڑی کی کوئی عمارت کہ جس پر رنگ برنگی شیشے چڑھے ہوں۔ تاریکی میں جس پر چاند سایہ ڈالتا ہو۔

میں ایڈورڈ جونس کو وہ دو ہزار روپے دے آیا تھا پروگرام کے مطابق اُسے مغرب کے وقت میرے یہاں پہنچنا تھا۔

سورج رفتہ رفتہ ڈھلتے ہوئے عمارت کی پشت پر آگیا۔ اس کی کرنیں دفتوں پر پڑیں پھر لوٹ گئیں۔ سائے لمبے ہو گئے۔ تاریکی نے عمارت کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

ہم بغیر لالٹین جلائے، اندھیرے ہی میں ایک حلقہ بنا کر اپنی محفوظ کی ہوئی چیزوں کے گرد بیٹھ گئے۔ اور ایک ایک چیز کو ۔ ۔ ۔ ۔ اندھوں کی طرح ٹٹولتے ہوئے، اُن سے وابستہ رنگوں کو یاد کرنے لگے۔

ہماری آنکھوں سے آنسو رواں تھے ۔ ۔ ۔ اور
ایڈورڈ جونس ماتمی دھنیں بجا رہا تھا۔

اگلے روز اُس عمارت سے اکھاڑی ہوئی رنگین کانچوں کو ہم سبھوں نے ملبے میں سے چن کر اپنی بینک میں محفوظ کر لیا۔

مُہر بند

میں عرصے سے ہائپر ٹینشن HYPER TENSION کا شکار تھا۔ دراصل میں عمر کی جس منزل میں تھا اس منزل پر پہنچ کر لوگوں کو عموماً اس قسم کے عارضے ہو جایا کرتے ہیں۔ شہر میں رہنے اور سیڈینٹری لائف SEDENTARY LIFE جینے کا اتنا بھی جزیہ ادا نہ کریں!

طبیب نے کئی قسم کے پکوان میرے حق میں مُضر قرار دے دیئے تھے۔ زندگی بھر، باقاعدہ علاج جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ شوقِ عبادت نہ تھا، تو پیدا کرنے، نیز میڈی ٹیٹ MEDITATE کرنے کی صلاح بھی دی تھی۔ گرچہ میں موٹر نشین نہ تھا، اس کے باوجود مجھ پر، صبح کی سیر کی پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

گھر سے دو ڈھائی سو قدم کے فاصلے پر سمندر تھا، جس کے کنارے کنارے، جنوب سے شمال کو ایک سڑک جاتی تھی۔ سڑک کے انتہائی جنوب میں مچھیروں کی بستی تھی اور شمالی سرے پر مچھیرے تو بستے ہی تھے؛

لیکن اُن کے درمیان مزدور پیشہ افراد بھی اپنے کنبوں سمیت آن بسے تھے۔
میرا معمول تھا کہ فجر سے پہلے میں حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہو جاتا، اور فجر ہوتے ہی گھر سے سیر کو نکل پڑتا۔ دو چار چھوٹی چھوٹی گلیوں سے گزر کر میں چند ہی منٹوں میں سمندر کے کنارے پہنچ جاتا۔ چند لوگ جو مجھ سے عمر میں بڑے تھے، حسبِ معمول وہاں موجود ہوتے اور اپنے اپنے اشغال میں مشغول۔ کوئی پدما آسن جمائے گیان دھیان میں محو ہوتا؛ کوئی (P.T.) ورزشیں کرتا؛ تو کوئی "پرانا یاما" کے ذریعے سواس بھرنے اور چھوڑنے کی مشق کرتا۔ دو چار غالباً اپنے فرائض سے اس وقت تک فارغ ہو چکے ہوتے، لہٰذا بینچوں پر بیٹھے وہ خوش گپیاں کیا کرتے۔
لیکن وہ، اُن سبھوں سے دور، بالکل الگ تھلگ بیٹھا، سمندر کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتا۔ میں جانتا تھا کہ نظریں تو اُس کی افق میں گڑی ہیں، لیکن ذہن کہیں اور غلطاں و پیچاں ہے۔ جسم موجود ہے مگر روح عالمِ دیگر کی سیر کر رہی ہے۔
میں اکثر اسی کے متعلق سوچتا ہوا اس دو ڈھائی کیلو میٹر لمبی سڑک کے شمالی سرے تک جا پہنچتا اور لوٹ کر تقریباً گھنٹے بھر بعد، پھر اُسی مقام پر آتا، تو اسے وہاں نہ پا کر مجھے مایوسی ہوتی۔ مجھے لگتا کہ فریم تصویر سے خالی ہو چکا ہے، اور منظر کس قدر اجڑا اجڑا سا لگ رہا ہے۔ گھر لوٹتے ہوئے بھی میں اُسی کے متعلق سوچتا۔ کہاں گیا ہوگا؟ اگر اپنے گھر گیا ہے تو اس کا گھر کہاں ہے؟ کیا اسی علاقے میں۔ کس

عمارت میں رہتا ہوگا؟ یہاں پر سینکڑوں چھوٹی بڑی عمارتیں ہیں ۔ یہ تنہا رہتا ہے یا اپنے کنبے کے ساتھ؟ کیا کرتا ہوگا یہ دن بھر؟ اخبار تو سبھی پڑھتے ہیں ۔ اس کی عمر کے لوگ تو اشتہار بھی نہیں چھوڑتے! یہ کم خور ہے یا بسیار خور؟ اپنے حلیے سے تو بلا کا ڈسپلنڈ DISCIPLINED آدمی لگتا ہے ۔ چست اور پھرتیلا! اُسے گھر کے بچّوں کو پارک میں لے جانا تو نہیں پڑتا؟ اسکول کے دیئے ہوئے ہوم ورک میں کیا یہ ان کا ہاتھ بٹاتا ہوگا؟ شام میں ٹی وی ضرور دیکھتا ہوگا ۔ اس کا پسندیدہ سیریل کون سا ہے؟ کہیں اسے شام ڈھلے چراغ جلانے کی لت تو نہیں؟ دو ڈھائی پیگ لینے کے بعد اس کے ذہن میں کیسے کیسے رومانی خیال آتے ہوں گے ۔ بچپن کی شرارتیں، جوانی کی لغزشیں اور سمجھے بوجھے عشق کے داؤ پیچ یاد کر کے یہ مسکرا دیا کرتا ہوگا ۔ اِسے وکل VOCAL سنگیت پسند ہے یا انسٹرومینٹل INSTRUMENTAL؟ کون ہے اس کا پسندیدہ کلاکار؟ سونے سے پہلے کیا اس کے رشتے دار اِسے دن بھر کی رُوداد سناتے ہوں گے؟ کیا یہ آپس میں سماجی اور سیاسی مسئلوں پر بات چیت کرتے ہوں گے؟ ان کے افکار یقیناً جُدا جُدا ہوں گے، تاہم گھر کا بزرگ ہونے کے ناطے سبھوں کو اس کے نظریے سے اتفاق کرنا پڑتا ہوگا ۔

یہ اور ایسے سینکڑوں خیالات اس کے متعلق میرے ذہن میں آتے ۔ کبھی میں ان سے لطف اندوز ہوتا تو کبھی ڈسٹربڈ DISTURBED عرصہ ہوا میں بھول چکا تھا کہ طبیب نے ہائپر ٹینشن سے راحت پانے کی

غرض سے مجھ پر صبح کی سیر فرض قرار دی تھی مگر اب میں اسی شخص کی دید کا اشتیاق لے کر گھر سے نکلا کرتا تھا۔ جوں ہی میں اسے بنچ پر بیٹھا ہوا دیکھ لیتا توں ہی مجھے قرار آجاتا۔

ایک روز میں اس سے کچھ فاصلے پر بچھی ہوئی بنچ پر جا بیٹھا۔ اس روز میں تہیہ کر چکا تھا کہ اس شخص کا مکمل احوال معلوم کیے بِنا نہ رہوں گا۔ وہ شخص بدستور سمندر کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ سمندر شانت تھا، کافی فاصلے پر ایک لائٹ ہاؤس تھا، جس کی جانب ایک موٹر بوٹ دھواں اڑاتی چلی جا رہی تھی۔ چند آبی پرندے چارے کی تلاش میں سمندر پر چکرا رہے تھے اور کبھی کبھار سمندر کی سطح پر غوطہ بھی لگا دیتے تھے۔

میں کسی صورت اس کے مینٹل فریم MENTAL FRAME میں داخل ہو جانا چاہتا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ اس وقت اس کی فضا کا اس پر کیا اثر ہو رہا ہے۔

ایک طریقہ تو یہ تھا کہ میں اس سے رسم و راہ پیدا کرتا پھر رفتہ رفتہ اس کے متعلق وہ ساری باتیں معلوم کر لیتا جن کے جاننے کا میں مشتاق تھا۔ دوسری ترکیب یہ تھی کہ ایک ملاقاتی کی حیثیت سے اس سے ملتا اور اس کی ڈسپلنڈ لائف DISCIPLINED LIFE کی تعریف میں چند جملے کہنے کے بعد اس کے ذاتی احاطے میں داخل ہونے کی کوشش کرتا۔ لیکن مجھ میں ایسا کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہ تھی۔ لہٰذا میں بنچ پر پہلو بدلتا، اُس کے اُٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔

اپنے مقررہ وقت پر وہ اطمینان سے اٹھا، پھر اُس نے بڑی شردھا سے سوریہ کو نمسکار کیا۔ غالبًا وہ آج کے رچولس RITUALS مکمل کر چکا تھا لہٰذا وہ جنوبی سمت میں واقع مچھیروں کی بستی کو چلا۔ اپنے اور اس کے درمیان کچھ فاصلہ قائم کر کے میں اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ بستی میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ وہ جھونپڑوں کے درمیان بنی ہوئی تنگ راہوں سے گزرتا ہوا، بستی کے آخری سرے پر جا پہنچا۔

بستی کے اس سرے پر پتھریلا ساحل تھا۔ سمندر میں چوں کہ جزر تھا، لہٰذا چٹانیں ننگی ہو چکی تھیں۔ ایک لمحہ گنوائے بغیر وہ ان پر نپے تلے قدم رکھتا ہوا سمندر کے متوازی آگے بڑھنے لگا۔ اس راستے وہ ایک اور چوڑی سڑک کی سمت چلا جا رہا تھا، جو انتہائی جنوب میں ایک ٹیلے تک جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ تین چار منٹوں میں وہ اس سڑک پر پہنچ گیا۔ چونکہ چٹانیں سیلن زدہ تھیں۔ لہٰذا مجھے ان پر اپنا قدم رکھتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا۔ دو ایک بار میں پھسلا بھی اور ان کی رگڑ سے اپنی ٹانگ چھلوا بیٹھا۔ اس کے باوجود میں نے تعاقب جاری رکھا اور بالآخر میں بھی اُس سڑک پر پہنچ گیا۔

سڑک پر موٹروں کی آمد و رفت نہ ہونے کی بنا پر، سڑک ویران پڑی تھی۔ کبھی کبھار کوئی موٹر کسی وحشت زدہ عورت کی طرح چیختی چلاتی تیز رفتار سے گزر جاتی۔ اِکّا دُکّا راہ گیر اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے، لیکن اس کا دور دور تک کہیں نام و نشان نہ تھا۔ میں طے نہ کر پایا تھا کہ وہ دائیں

جانب گیا ہے یا بائیں ۔ دل کہتا تھا کہ تو دائیں اور بڑھ ، وہ اسی سمت گیا ہے ۔ دماغ قدم روکتا تھا ۔ اسی کشمکش میں دو ڈھائی منٹ گزر گئے۔ آخر کار میں دل کی آواز پر لبیک کہتا ہوا دائیں جانب چل پڑا۔

قدم تیزی سے اٹھتے چلے جا رہے تھے ۔ اپنی غیر معمولی رفتار پر مسرت ہو رہی تھی ۔ عرصے تک صبح کی گئی سیر کا فیض مجھے اب مل رہا تھا۔ ایک شخص اچانک مجھے اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا ۔ چند لمحوں میں وہ میرے قریب آ گیا۔ میں نے اسے روکا ۔ پھر اسے اس آدمی کا حُلیہ بتا کر پوچھا کہ کیا اس حلیے کا آدمی راہ میں اسے دیکھائی دیا ہے۔ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور سڑک کے بالکل آخری سرے پر واقع ایک اجڑی ہوئی سی گول عمارت کی جانب اشارہ کرتا ہوا بولا کہ اس نے مذکورہ شخص کو اس عمارت میں داخل ہوتے ہوئے چند منٹ پہلے دیکھا ہے ۔ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا ، میں اس مکان کی جانب چل پڑا ۔ جوں جوں میں مکان کے قریب ہوتا جاتا تھا ، توں توں مکان کی ہئیت واضح ہوتی جاتی تھی ۔ مکان بیلن نما تھا اور دو منزلہ تھا ۔ پلاستر یا تو اس پر شروع ہی سے کیا نہیں گیا تھا یا مرورِ زمانہ کے ہاتھوں جھڑ چکا تھا ۔ اُس کی چھت پر نہ تو کوئی اینٹینا تھا ، نہ کسی قسم کی کوئی اور فیٹنگ ۔ اُس کی کسی منزل سے کوئی تار باہر کو جھولتا ہوا دکھائی نہیں دیتا تھا ۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی تقریباً دو درجن کھڑکیوں پر پلائی چڑھا کر انہیں مُہر بند کر دیا گیا تھا ۔ اس ترکیب سے عمارت کے متعدد دروازے بھی سیل SEAL کر دیئے گئے تھے ۔

-

میں نے اپنی حیرت واستعجاب پر قابو رکھتے ہوئے اُس پُراسرار عمارت کے دو تین چکر لگائے۔ میری کوشش تھی کہ میں اس عمارت کا کوئی ایسا دروازہ ڈھونڈ نکالوں جو مُہر بند نہ ہو اور میں اس راستے سے عمارت میں داخل ہو جاؤں۔

جب میں عمارت کے دو چار چکر لگا چکا تو مجھے اچانک خیال آیا کہ اُس راہ گیر نے میری غلط راہنمائی تو نہیں کی اور مجھے مسخرہ بنا کر چلتا بنا۔ جی میں آیا کہ ایک آخری چکر عمارت کے گرد اور لگا لوں اور خوب ٹٹول ٹٹول کر ہر ہر دروازے کو دیکھ لوں۔ اپنی ناکامی کا اعتراف کر لینے سے قبل اپنی تمام تر کوششوں کو بروئے کار لانا کسی حد تک لازمی تھا۔

پہلا، دوسرا، تیسرا، غرض یہ کہ میں نے چھے دروازے دیکھ لئے؛ وہ سب کے سب مکمل طور پر بند تھے۔ بادلِ ناخواستہ میں ساتویں دروازے کو ایک نابینا کی طرح ٹٹولنے لگا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ دروازہ میرے ہاتھ کے دباؤ سے اندر کی طرف کھل گیا۔ اندر اندھیرا تھا، یا کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا؛ اس کا اندازہ میں فوراً نہ کر سکا۔ میرے حواس معذور ہو چکے تھے اور میری راہنمائی نہیں کر پا رہے تھے۔ اس کے باوجود میں دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ چند قدم آگے مجھے دُھواں چھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ آگے انتہائی کمزور پیلی سی روشنی ہو رہی تھی۔ لہٰذا میری ہمت بندھی، میں آگے بڑھا۔ سارے میں ایک ناقابل بیان بو سی پھیلی ہوئی تھی ایسی بو جو عرصے تک مکان بند رکھنے سے کمروں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ آگے

ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی، جس پر چادر تانے کوئی سو رہا تھا۔ میں چارپائی کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ میں نے اس کمزور پیلی سی روشنی میں دیکھا، چارپائی پر ایک جواں سال لڑکا سو رہا ہے۔ رسوئی میں استعمال ہونے والا سامان زمین پر بے ترتیبی سے پڑا ہے۔

میں نے آہستہ سے آواز دی "میاں! آنکھیں کھولو۔"

لڑکے نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے دھیمی آواز میں پوچھا "آپ... آپ کون ہیں؟"

اب میرے لئے اپنا تعارف کرانا مشکل ہوا۔ کچھ سوچ کر میں نے کہا "اسی علاقے میں رہتا ہوں، ایک صاحب سے ملنے آیا ہوں۔"

"سوائے میرے، اس عمارت میں اور کوئی نہیں رہتا۔"

"تمہارے والد، یا کوئی اور رشتے دار۔"

"جی نہیں، میرے والد کا تو عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔"

"اچھا" میں نے لہجے سے اپنے دکھ کا اظہار کیا۔

اس درمیان میں، میں کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ کرسی ایسی تھی کہ جس کا ہتھا اکھڑ چکا تھا۔

لڑکا بھی اٹھ کر دیوار کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔

میں نے پوچھا "اس عمارت میں اندھیرا کیوں ہے، اس کی کھڑکیاں اور دروازے کیوں مہر بند کر دیئے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ ابا کہتے تھے یہ عمارت شروع ہی سے اسی وضع کی ہے۔"

"مگر انہوں نے ان کھڑکیوں اور دروازوں کو کھولنے کی کوشش نہیں کی؟"
"جی نہیں۔ ان کا کہنا تھا یہ عمارت جس حال میں ہمیں نصیب ہوئی ہے، ہمیں اسے اُسی حال میں رکھنا چاہیئے، ہم کون ہوتے ہیں، اس کی وضع بدلنے والے۔"
"تمہارے والد کا انتقال کب ہوا؟"
"برسوں بیت گئے۔ میں بہت چھوٹا تھا۔ سات، آٹھ سال کا۔"
قدرے توقف کے بعد اس نے کہا "ایک بات پوچھوں۔"
"ضرور پوچھو" میں بولا۔
"کہیں آپ کسی شخص کے تعاقب میں تو یہاں تشریف نہیں لائے؟"
"کیا" میں نے انتہائی حیرت کا اظہار کیا۔
"سال میں دو چار افراد کسی ایسے ہی پراسرار شخص کا سراغ ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں تک آجاتے ہیں۔"
میں اپنی خفت مٹانے کو بولا "یہ سچ ہے کہ میں ایک شخص کے تعاقب ہی میں یہاں آیا ہوں، بہر حال میں نہیں جانتا کہ اب وہ کہاں ہے۔"
اس نے کہا "وہ جو کوئی بھی ہو، میں اس کے وجود سے قطعی لاعلم ہوں۔ بہر صورت میرے والد بڑے متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ وہ گھنٹوں سمندر کے کنارے بیٹھے یادِ الٰہی میں مشغول رہا کرتے تھے۔ اکثر اُن کا توشہ، سمندر سے آتا تھا۔"
"سمندر سے آتا تھا" میں تقریباً چیخ کر بولا ... تمہارے والد سمندر

کنارے ... ؟"

مجھے اپنے حواس معطل ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں اپنے پر قابو پاتے ہوئے بولا :

"تم کہہ رہے تھے کہ اُن کا توشہ سمندر سے آتا تھا۔ تم دِل لگی تو نہیں کر رہے ہو مجھ سے۔"

"ہرگز نہیں۔ جانے کیوں آپ کو میری بات ناقابلِ یقین لگ رہی ہے۔" اس کے لہجے سے خفگی عیاں تھی۔ اس نے پھر کہا :

"آپ نے اب تک میرے طرزِ زندگی پر توجہ نہیں کی۔ میں نے اس عمارت میں اپنے آپ کو محصور کرلیا ہے۔ میں اس کی حدود سے باہر نہیں جاتا۔ میں نے اس دنیا کا داخلہ اپنے اوپر بند کرلیا ہے۔"

"لیکن تمہارے والد نے تو کوئی حصار اپنے گرد نہیں کھینچا تھا۔ ابھی تم کہہ رہے تھے کہ ان کا تو دنیا جہاں سے باقاعدہ تال میل تھا۔"

"یقیناً تھا۔ یوں تو میری بھی رسم و راہ کسی حد تک دنیا والوں سے تھی۔ ایک روز میں اپنے والد کے ساتھ سمندر کنارے بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص بڑی ہیبت کے عالم میں میرے والد کے قریب آیا اور کہنے لگا کہ اس بچے کو ایکسپوژر EXPOSURE سے بچاؤ۔ اس پر پردہ چھوڑو۔ والد نے تابڑ توڑ مجھے چادر میں ڈھک لیا اور گود میں لئے گھر آ گئے۔ اس دن کے بعد میں نے اپنی دہلیز کے باہر قدم نہیں رکھا۔"

"تو کیا، تمہارے لئے اب اس دُنیا میں کوئی کشش باقی نہیں رہی ؟"

"قطعی نہیں" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ اس نے پھر کہا :
"اب یہ دنیا قطعاً ویسی نہیں رہی۔ آپ ہی بتائیے، آپ کے لئے اس میں کیا کشش ہے؟"
اس سوال کا مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔
وہ مجھے اُلجھن میں ڈال چکا تھا۔ میں کیوں کر اس بات کا یقین کر لیتا؟ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اس کے اپنے آپ کو اس قدر پر اسرار ظاہر کرنے میں آخر کیا تک تھی۔ کہیں اشارے کنائیوں میں یہ مجھے رموزِ زندگی تو نہیں سمجھا رہا تھا۔ یہ مجھ سے کیا توقع رکھتا ہے۔ میں نے پوچھا :
"اس عمارت میں سدا قید رہنے سے تمہارا جی نہیں گھبراتا؟"
"نہیں جناب! نہ میں قید ہوں نہ اس عمارت کے حصار میں۔ شاید آپ کو علم ہو کہ ہر عمارت میں ایک تہہ خانہ ہوتا ہے۔ اس عمارت میں بھی ہے۔ تہہ خانے اگر استعمال میں نہیں رکھے جاتے تو ان میں حشرات الارض بسیرا کرنے لگتے ہیں۔ ابا نے جب مجھے باہر کی دنیا سے پردہ کر لینے کی ہدایت کی تو انہوں نے اس تہہ خانے سے بھی مجھے واقف کرا دیا۔ انہوں نے یہ بات بھی میرے ذہن نشین کرائی کہ جب بھی دل گھبرائے یا حبس محسوس ہو تو میں اس تہہ خانے میں اُتر جایا کروں۔ میرا اضطراب کم ہو گا اور تازہ دم ہو جایا کروں گا۔"
میں نے پوچھا "تو کیا تم تہہ خانے میں اُترا کرتے ہو؟"
"اکثر، کبھی دن میں دو، دو؛ تین تین بار اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ میں

وہاں سے سطح پر آتا ہی نہیں۔ دو، دو، چار، چار، روز کے لئے میں وہیں رک جاتا ہوں۔

اس لڑکے کی باتیں اب میری فہم سے بالا ہوتی جارہی تھیں۔ وہ اسرار کی تہوں میں چھپا چلا جارہا تھا۔

میں نے ازراہِ گفتگو کہا "کہاں ہے وہ تہہ خانہ؟"

اس نے شہادت کی انگلی سے مغربی دیوار میں بنے ہوئے ایک دریچے کی طرف اشارہ کیا:

"وہ رہا۔"

میں بولا "کیا میں دیکھ سکتا ہوں؟"

اس نے کہا "یقیناً۔ پر ذرا ٹھہریئے، میں آپ کو لالٹین لا دوں۔"

وہ آہستہ سے اٹھا۔ اس نے چارپائی کے پیچھے سے لالٹین نکالی۔ اُس کی چمنی صاف کی، اس کی بتی اونچی کی پھر چولہے کے پاس پڑی ماچس سے اسے روشن کیا۔ لالٹین کے روشن ہوتے ہی سارا کمرہ مجھ پر ایک کتاب کی طرح کھل گیا۔ ہر چیز انتہائی قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ اس کا بستر پاک وصاف تھا۔ تکیے کے غلاف پر کوئی دھبہ نہ چادر پر۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ ناگوار سی بو اب تازہ پھولوں کی خوشبو میں بدل چکی تھی۔ میں نے اسی روشنی میں دیکھا کہ لڑکے کا چہرہ کلین شیو ہے اُس کی آنکھیں بڑی بڑی اور روشن ہیں۔ ناک ستواں ہے اور پیشانی کشادہ وہ تازہ دھلے ہوئے مشرقی وضع کے کپڑوں میں ملبوس تھا۔

وہ میرے ساتھ ساتھ اس دریچے تک آیا۔ اس کی کنڈی کھسکائی،
اور دریچہ کھول دیا۔ دریچے کے کھلتے ہی تازہ اور فرحت بخش ہوا کا جھونکا آیا۔
اس نے وہ لالٹین مجھ کو تھماتے ہوئے کہا :
"اسے سنبھالئے اور ذرا احتیاط سے سیڑھیاں اتریئے ۔ گھبرانے کی کوئی
بات نہیں ـــــ آپ کے لوٹنے تک میں چائے دم کر رکھوں گا۔"
مجھے اچانک محسوس ہوا کہ میں کسی بھنور میں آپڑا ہوں۔ میں کس غرض
سے سیر کو نکلا کرتا تھا۔ میں نے اس شخص میں بلاوجہ دل چسپی لی۔ ایسی کون
سی ادا بھا گئی مجھے اس کی کہ میں اپنا کام دھندا چھوڑ کر اس کا پتا ٹھکانا معلوم
کرنے پر آمادہ ہوا ـــــ اب جو اس عمارت میں داخل ہوا ہوں تو وہ
شخص تو لاپتا ہے، اس لڑکے سے رسم وراہ پیدا ہو چکی ہے اور اس کے موہ
میں آکر ایک تہہ خانے میں ـــ جس میں تاریکی ہی تاریکی ہے ـــ اُترنے
پر کمربستہ ہوں۔ کیا میں اپنی سوجھ بوجھ کھو چکا ہوں، یا میری قوتِ تمیز
زائل ہو چکی ہے۔ میں کسی طلسم کا شکار تو نہیں ہوں!
لڑکے نے زیرِ لب مسکرا کر پوچھا "آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟"
کیا بتاؤں، اپنے اعمال، اپنی حرکات غرضیکہ اپنی زندگی کی بے معنویت کا مجھے
اچانک احساس پیدا ہوا ہے۔ میں سراغ رساں ہوں، نہ پچھلے عہد کا کوئی خلیفہ
جو دوسروں کے آلام و مصائب دور کرنے کی خاطر گھر سے نکلا کرتا تھا۔ میری
حقیقت اس بھٹکے ہوئے مسافر کی سی ہے، جسے اپنی منزل کا پتہ نہیں، نہ
سہی، اپنے مسکن کا علم تو سبھوں کو ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اُسے اپنے

مسکن کو لوٹ جانا چاہیئے۔"

میں نے آہستہ سے دریچہ بند کر دیا۔ چٹخنی چڑھادی اور نڈھال قدموں سے پھر اُسی کرسی پر آبیٹھا۔ مجھے پھر شاک لگا۔ اس کرسی کے دونوں دستے صحیح وسلامت تھے۔ چند منٹوں میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر چائے پی۔ چائے پیتے ہوئے وہ بدستور مسکرائے جارہا تھا۔ جانے کیوں اسے مسکراتے ہوئے دیکھ کر مجھے اس پر غصہ نہیں آیا۔

چائے ختم کر کے میں اٹھا:

"اچھا میاں، چلتا ہوں، خوش رہو۔"

یہ بول کر میں نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھا دیا۔ اُس نے جُھک کر بڑے تپاک سے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولا "خدا حافظ"۔

میں عمارت سے باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف چلا تو میں نے دیکھا کہ میں عمارت کے بالکل وسط میں کھڑا ہوں، میری چاروں طرف دروازے ہی دروازے ہیں پر سبھی دروازے مُقفل! میری دشواری کا اندازہ غالباً وہ کر چکا تھا۔

"دائیں سے ساتواں دَر۔"

اُس نے مشکل کشائی کی۔ ایک پل گنوائے بغیر میں اس دروازے تک جا پہنچا۔ جوں ہی دروازے کو میں نے اپنی جانب کھولا، توں ہی دروازہ کھل گیا۔ میں نے الوداعی نظر اس پر ڈالی اور اسے تہہ خاتے پر بھی۔ اس درمیان میں وہ میرے قریب آچکا تھا، مسکراہٹ بدستور اس کے لبوں

پر کھیل رہی تھی۔ باہر کی روشنی میں اس کا چہرہ تازہ گلاب کا سا لگ رہا تھا نیز اس کی آنکھوں سے رحمت ٹپک رہی تھی۔

"سُنیئے :

میرے قدم رُک گئے۔

"بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں "

میں خاموش رہا۔

قدرے توقف کے بعد وہ بولا :

"آپ اوروں کی ٹوہ میں نہ رہا کریں۔ اس کے بجائے آپ اپنا گم شدہ تلاش کریں "

یہ کہہ کر وہ خلاء میں گھورنے لگا۔ مانو میری بجائے میرے ہم زاد سے مخاطب ہو!

وہ پھر بولا :

" آپ کی دنیا کی تقریباً ہر عمارت میں لفٹ ہے، پر دکھ کی بات یہ ہے کہ لفٹ اوپر ہی کو جاتی ہے۔۔۔"

کچھ وقفے کے بعد وہ گویا ہوا :

بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہر عمارت میں ایک تہہ خانہ بھی ہوتا ہے۔

آپ کی عمارت میں بھی ہے۔ اس کی صفائی کرائیے۔ اس میں روشنی کیجئے، پھر تہہ خانے میں اتریئے۔ دیکھئے کہ تہہ خانے کے راستے آپ

کہاں پہنچتے ہیں ......"

تشکر آمیز نظروں سے میں نے اسے آخری بار دیکھا۔ وہ بدستور مسکرائے جا رہا تھا۔ پھر میں اس عمارت کے باہر چلا آیا۔ میرے باہر نکلتے ہی وہ دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے ارد گرد نظر ڈالی تو دیکھا باہر کی دنیا میں وہی لیلا رچی ہوئی تھی۔

گمشدہ باپ

ہم تمام بہن بھائیوں کا مشترکہ فیصلہ تھا کہ وہ ہمارا باپ نہیں ہے۔
تو پھر، کون ہے؟ یہ ایک راز تھا اور ہم حقیقت سے ناواقف تھے۔ کچھ عرصہ پہلے وہ ہمارے گھر میں باپ کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ ہماری ماں اُسی کے کمرے میں سویا کرتی تھی۔ موروثی جائیداد بھی اسی کے قبضے میں تھی۔ رسموں کو انجام دینے وقت اور سماجی تقریبوں میں وہی پیش پیش رہتا۔ ہم چاروں بھائیوں کی بیویوں سے ٹھٹھا مذاق کرتا۔ ہر ماہ باقاعدگی سے، ہمیں اپنی اپنی تنخواہ کے لفافے اس کے سپرد کر دینے ہوتے تھے۔ جن میں سے بڑی معمولی سی رقم وہ ہمیں جیب خرچ کے لیے دیا کرتا تھا۔ گھر کا تمام خرچ وہ خود ہی چلاتا، ہمیں گھر کے کام کاج میں دخل دینے کا کوئی حق نہ تھا۔ کنبے کی ساری ذمہ داری اس نے اپنے سر لے رکھی تھی
لیکن وہ کیا بات تھی کہ جس نے ہمارے دل میں شک کے کانٹے چبھو دیے تھے، جن کے زخموں سے اٹھتی ہوئی ہر ٹیس ہمیں بار بار وہ ناخوش گوار

بات یاد دلایا کرتی تھی کہ وہ ہمارا باپ نہیں ہے ۔ وہ ہمارا باپ نہیں ہے، تو پھر کون ہے ؟ یہ ایک راز تھا، اور ہم حقیقت سے ناواقف تھے

دراصل میانے قد، درمیانے ہاڑ، سانولے رنگ اور بیضوی چہرے کا کوئی بھی شخص ہمارے باپ کی جُون بدل سکتا تھا ۔ جون بدلنے میں مزید سہولت یہ تھی کہ ہمارے باپ کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی ۔ وہ ڈھیلی ڈھالی ہندوستانی پوشاک پہننے کا عادی تھا ۔ ساتھ ہی چکا چوند سے بچنے کے لئے وہ سیاہ چشمہ لگایا کرتا تھا ۔ چوں کہ اس حلیے میں افشا کا کم اور اخفا کا زیادہ امکان تھا ۔ اس لیے کوئی بھی شخص اس کا حلیہ اختیار کرسکتا تھا ۔ ہوا بھی یہی تھا ۔ ایک پر اسرار شخص ہمارے باپ کا مرتبہ حاصل کر بیٹھا تھا ۔

سال بھر پہلے کی بات ہے کہ ہم نے اپنے معالج کے مشورے پر اپنے باپ کو شہر کے سب سے بڑے اسپتال میں داخل کیا تھا ۔ ستّر برس کے آدمی کو اس گنجان آباد شہر میں جو بھی طبعی عارضے لاحق ہو سکتے تھے خوش قسمتی سے کسی ایک سے بھی یہ دوچار نہ تھا ۔ جو تھا تو بس یہی کہ ہمارا باپ بروں کائی ٹس ۔ BRONCHITIS کا شکار تھا ۔

نومبر کے مہینے میں اس شہر میں ہلکی ہلکی ٹھنڈ پڑنے لگتی ہے ۔ ہمارا باپ صرف تہمد پہن کر سونے کا عادی تھا پہلے تو اس ٹھنڈ سے اس کا سینہ جکڑ گیا ۔ پھر وقفے وقفے سے اس پر کھانسی کے دورے پڑنے لگے ۔ ایسے دورے کہ ہر بار یوں محسوس ہوا کہ کوئی آسیب، اس کا سینہ پھاڑ کر، باہر نکلنے

پر آمادہ ہے۔ اور بخار ایسا چڑھا کہ تپش پیما کے قالب میں نہ سماتا تھا۔

اسپتال میں دوسرے روز اس کے مرض پر قابو پالیا گیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اب وہ بڑی راحت محسوس کر رہا ہے۔ بخار میں کمی آچکی ہے۔ کھانسی کے دورے بھی اب اُسے کم کم پڑتے ہیں۔

اسے اسپتال میں داخل ہوئے تقریباً ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ ہم روزانہ اس کی مزاج پُرسی کو جایا کرتے تھے۔ ایک روز جب ہم اسپتال پہنچے تو ہم نے اپنے باپ کے کمرے میں ایک اجنبی کو لیٹا ہوا پایا۔

ایک نرس کمرے میں موجود تھی اور مریض کے چارٹ میں اندراج کر کے ابھی ابھی فارغ ہوئی تھی۔ ہم نے اُس نرس سے پوچھا:

"سسٹر! یہ کون صاحب ہیں، جو ہمارے باپ کی جگہ پر لیٹے ہوئے ہیں؟"

"یہ شہر کے بڑے معزز آدمی ہیں۔ ان کا نام..."

اس شخص میں بنا کوئی دلچسپی لیے ہم نے پوچھا۔

"مگر ـــــ ہمارے بابا کہاں ہیں؟"

"وہ ـــــ وہ ـــــ جنرل وارڈ میں موجود ہیں۔"

"جنرل وارڈ ـــــ! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"جی، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ وہ جنرل وارڈ ہی میں ہیں۔ انھیں کے شدید اصرار پر ہم نے انھیں یہاں سے منتقل کیا ہے۔"

یہ کہتے کہتے اس نے معائنے کا سامان بٹورا۔ اور جب وہ کمرے سے

جانے لگی تو بولی:

"آپ کے بابا اکثر مجھ سے کمرے کا ریٹ اور دیگر اخراجات کی تفصیل معلوم کیا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ عمر کی جس منزل میں ہیں وہاں انھیں ایسی راحتوں کی چنداں ضرورت نہیں۔ حتیٰ الامکان انھیں فضول خرچیوں اور سماجی چونچلوں سے بچنا چاہیے۔"

نرس نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ آج ان کا جنرل وارڈ میں منتقل ہونے کا اصرار اتنا بڑھا کہ انھوں نے اسپتال کے ڈین DEAN, کو فون پر دھمکی دی کہ اگر انھیں اس کمرے سے جنرل وارڈ میں منتقل نہ کیا گیا تو، وہ عملے کی نظر بچا کر اسپتال سے فرار ہو جائیں گے۔

اس بات کو ہمارا ذہن تسلیم کرنے سے قاصر تھا۔ کیوں کہ ہمارا باپ عُمدہ رہائش، عمدہ غذا، عمدہ سواری، حتیٰ کہ عمدہ علاج پر یقین رکھتا تھا۔ اس کے برعکس اپنے آپ کو پرائیویٹ روم سے جنرل وارڈ میں منتقل کروانے میں کیا مصلحت تھی؟ ہم اس مصلحت سے ناواقف تھے۔

جنرل وارڈ کے داخلی دروازے پر پہنچ کر ہم ٹھٹھک گئے۔ وارڈ میں بیسیوں مریض اسپتال کی یونیفارم پہنے ہوئے تقریباً یکساں آسن میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ چند اپنی پشت تکیہ سے ٹکائے نیم دراز تھے۔ اکثر اپنے اپنے ملاقاتیوں سے باتوں میں مشغول تھے۔ ایک وارڈ بوائے دواؤں کی ٹرالی لیے وہاں سے گزر رہا تھا۔ ہم نے اُسے روکا، پھر اسے اپنے باپ کا نام بتا کر معلوم کیا کہ کیا وہ ہماری رہنمائی اس تک کر سکتا ہے۔

وارڈ بوائے نے وارڈ کے آخری سرے پر ایک میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی نرس کی جانب اشارہ کیا، پھر ہمیں اُس نرس سے رجوع کرنے کا مشورہ دے کر چلا گیا۔

پَل بھر کے لیے ہمیں محسوس ہوا کہ ہم نے اپنے باپ کو اس مجمع میں کھو دیا ہے۔

کیا یہ محض اندیشہ تھا؟ کیا حقیقت اس کے برعکس تھی؟

چالیس پچاس قدم چل کر ہم نرس کے پاس پہنچ گئے۔ جب ہم نے اپنے باپ کی تمام تفصیل اسے کہہ سُنائی تو اس نے یہ کہہ کر ہماری ڈھارس بندھائی کہ ہمارا باپ اسی وارڈ میں ہے اور وہ اس سے واقف ہے۔ پھر وہ ہماری رہنمائی کرتی ہوئی وارڈ کے اُتری کونے میں رکھے ہوئے بیڈ تک آئی۔ اس بیڈ پر ہم نے اپنے باپ کو لیٹا ہوا پایا۔ اس کے نتھنوں سے آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا اور کلائی میں گلوکوز کی سوئی گڑی ہوئی تھی۔

اپنے باپ کو اس عالم میں دیکھ کر ہم مضطرب ہو اٹھے۔

"سسٹر! یہ کیا؟ کل تک تو یہ بھلے چنگے تھے ڈاکٹر آج انھیں ڈسچارج کرنے والے تھے۔"

نرس نے بتایا:

"دوپہر میں جوں ہی یہ اِس وارڈ میں منتقل ہوئے توں ہی ان کی صحت کا توازن بگڑ گیا۔ ان پر کھانسی کا ایسا دورہ پڑا کہ یہ جان کنی کے

عالم میں مبتلا ہو گئے۔ میں نے ریذیڈنٹ ڈاکٹر RESIDENT DOCTOR کو فوراً طلب کیا۔ وہ دوڑے دوڑے آئے، ان کی مکمل جانچ کی، دوا انجکشن لگائے، ایک دو دوائیاں بدلیں۔ ہم اُنھی کی ہدایت پر آپ کے بابا کو آکسیجن اور گلوکوز دے رہے ہیں۔

ہمارے باپ کی آنکھیں بند تھیں اس کے ہونٹ یوں کھُلے تھے گویا وہ ہم سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ ہم نے اپنے اپنے کان قریب کر دیے۔ چند مہمل سے الفاظ اس کے منہ سے ضرور نِکلے۔ لیکن ہم ان کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے۔ اس اُمید پر کہ شاید وہ اپنی بات دہرائے۔ ہم اس کے سرہانے بدستور بیٹھے رہے۔ لیکن ہمارے باپ نے نہ تو دوبارہ آنکھیں کھولیں اور نہ ہی اپنے لبوں کو جنبش دی۔ بس نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا رہا۔ جب ملاقات کا وقت ختم ہوا۔ تب ہم تمام بہن بھائی گھر کو روانہ ہوئے۔

آج ہم تمام واقعات پر از سرِ نو غور کرتے ہیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ گھر سے اسپتال پہنچتے پہنچتے یا اس پرائیویٹ روم میں قیام کے دوران میں ہمارے باپ کی جگہ اس کے ہمزاد نے لے لی تھی۔

اُس شام گھر پہنچ کر ہم تمام بہن بھائی اسی نکتے پر تبادلہ خیال کرتے رہے کہ ہمارا باپ آخر جنرل وارڈ میں کیوں منتقل ہوا۔ ساتھ ہی اس کی حرکات و سکنات سے ہمیں جس اجنبیت کا پراسرار احساس ہونے لگا تھا، آخر اس کی کیا وجہ ہے۔

دو روز بعد ڈاکٹر نے ہمارے باپ کو اسپتال سے ڈسچارج DISCHARGE کر دیا۔ ہم اُسے گھر لے آئے۔

آٹھ دس دِنوں میں ہم تمام بہن بھائیوں اور گھر کے دیگر افراد نے باپ کے عادات و اطوار میں حیرت انگیز تبدیلی دیکھی۔ باپ کے رویے میں زمین و آسمان کا فرق آچکا تھا۔ مذہبی رسموں اور سماجی تقریبوں میں پیش پیش رہنے والا شخص اب گوشہ نشین ہو چکا تھا۔ وہ دن رات اپنے کمرے میں ہی پڑا رہتا۔ کسی ضروری حاجت ہی کے تحت باہر آتا۔ ہماری ماں کو بھی اس نے اپنے کمرے میں آنے سے منع کر دیا تھا۔ اس دوران میں حسب معمول ہمیں تنخواہیں بھی ملیں۔ خلافِ توقع تنخواہ کے لفافے اس نے ہم سے طلب نہ کیے۔ لگتا تھا کہ دنیاداری سے اس کا جی اچاٹ ہو چکا ہے۔ دنیاوی امور سے، وہ ہر ممکن طریقے سے کنارا کش ہو جانا چاہتا تھا۔ ایک دن تمام جائیداد اور دیگر املاک اس نے ہمارے نام لکھ دیں۔ اس کے باوجود ہمارا شبہ رفع نہ ہوا۔

ہم اکثر سر جوڑ کر بیٹھتے اور اسی کے متعلق سوچا کرتے تھے۔ یوں بھی ہوتا کہ جب بھی ہمیں اپنے کاموں سے فرصت ملتی، اس کی شبیہہ ہمارے ذہن میں گھوم جاتی۔ اس کی بوالعجب شخصیت ہمیں ہانٹ کرنے لگتی۔ ہم کسی صورت میں یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ وہ ہمارا حقیقی باپ ہے۔ وہ ہمارا حقیقی باپ نہیں ہے؟ تو پھر کون ہے؟ یہ ایک راز تھا۔ اور ہم حقیقت سے ناواقف تھے۔

ایک روز ہم بہن بھائیوں نے طے کیا کہ ہم اپنے باپ کا بلڈ ٹیسٹ BLOOD TEST کروائیں ۔ اور معلوم کریں کہ آیا اس کا بلڈ گروپ اور ہمارے باپ کا بلڈ گروپ یکساں ہے بھی یا نہیں ۔ بلڈ سیمپل BLOOD SAMPLE لینے کے لیے ہم نے پیتھو لوجسٹ PATHALOGIST کو گھر پر ہی بلا لیا ۔ لیکن یہ اپنا خون دینے پر آمادہ نہ ہوا ۔ ہم نے اُسے کئی واسطے دیے اُسے باور کرانے کی کوشش کی کہ فیملی ڈاکٹر ہی کی ہدایت پر اس کا بلڈ ٹیسٹ کروایا جا رہا ہے جو اس کے مرض کی شناخت کے لیے ضروری ہے ۔ بجائے اپنا بلڈ سیمپل BLOOD SAMPLE دینے کے وہ بار بار یہی کہتا :

" تم لوگوں کو مجھ پر شبہ ہے ۔ تم سدا میری ٹوہ میں رہتے ہو ۔ کسی نہ کسی حیلے بہانے سے میری اصلیت جاننے کی کوشش کرتے ہو ۔ اپنا سب کچھ تو تمہیں دے چکا ۔ مکان کے اس کونے میں پڑا رہتا ہوں ۔ تم سے کچھ بھی تو طلب نہیں کرتا ۔ اس کے باوجود تم مجھے آزار پہنچانا چاہتے ہو ۔ اگر مجھ سے اتنے ہی بیزار ہو چکے ہو تو مجھے کسی ویرانے میں چھوڑ آؤ ۔ چیل کوؤں کی خوراک بن جاؤں گا ۔ "

اس کی منت سماجت سے ہم بہن بھائیوں کا دل نہ پسیجا ۔ اصلیت کا پتہ چلانے کے جنون میں ہم بہن بھائیوں نے اس کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیے ۔ جوں ہی ڈاکٹر نے سرنج اس کی رگ میں کھبوئی اس کے شریر میں تشنج سا پیدا ہو گیا ۔ پھر اس نے ایک گہری سسکی لی ۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔

اگلے روز پیتھو لوجسٹ نے رپورٹ ہمارے حوالے کر دی ۔ ہمارے باپ کا

بلڈگروپ اور پوزیٹیو (O + VE) تھا، ہم کا بھی وہی نکلا۔ ڈاکٹر نے ہمیں بتایا کہ یہ بڑا کامن بلڈگروپ ہے۔ اکثر لوگوں کا یہی بلڈگروپ ہوتا ہے۔ کسی کی پیدائشی اصلیت جاننے کا یہ کوئی جینوئن GENUINE ٹیسٹ نہیں ہے۔ ہمیں اپنی اسکیم کی ناکامی کا بے حد افسوس ہوا۔

دن بیتتے چلے گئے۔ لیکن ہم بہن بھائی اس کے متعلق اپنے شکوک دلوں سے رفع نہ کر سکے۔ کوئی لمحہ ایسا نہ گذرتا کہ اس نشتر کی چبھن ہم اپنے جگر میں محسوس نہ کر پاتے ہوں۔ ہم ہر دم یہی سوچا کرتے کہ وہ ہمارا حقیقی باپ نہیں ہے ـــــ تو پھر کون ہے؟ یہ ایک راز تھا اور ہم حقیقت سے ناواقف تھے۔

ذہن پر مسلسل تناؤ رہنے کی وجہ سے اس کے تعلق سے ہمارے رویے میں برہمی جھلکنے لگی۔ ایسی برہمی کہ جسے ہر ہوش مند محسوس کر سکتا تھا۔ تو پھر وہ کیوں نہ محسوس کرتا۔ ہم اپنی جھنجلاہٹ اور ناراضگی کے اظہار میں کوئی پس و پیش نہ کرتے۔ بلکہ بعض بعض موقعوں پر بلا کسی رُو رعایت کے اپنے رویے کو جارحانہ بنالیا کرتے تھے۔ اس سے گفتگو کرتے ہوئے ہم اپنا لہجہ درست اور آواز بلند رکھا کرتے تھے۔

ہم بہن بھائیوں میں سے ایک دور کی کوڑی لایا۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ اس کی بتیسی اپنے FAMILY DENTIST فیملی ڈینٹسٹ کو دکھلائی جائے۔ ہمارے باپ نے اسی دندان ساز سے اپنی بتیسی چند ماہ قبل بنوائی تھی۔ ہمارے بھائی کا کہنا تھا کہ دندان ساز اپنے مخصوص گاہکوں کے دانتوں کے سانچے عموماً جلدی نہیں توڑتے۔ بلکہ سال دو سال تک انھیں محفوظ رکھتے ہیں۔

دندان ساز کو جب ہم نے اپنے منصوبے سے واقف کرایا تو بدقت تمام وہ ہمارا ساتھ دینے پر راضی ہوا۔ اوّل تو اسے بیسیوں غلیظ اور متعفن سانچوں اور بتیسیوں میں سے ہمارے باپ کی بتیسی کا سانچہ تلاش کرنا تھا۔ دوم یہ کہ رات گئے اسے ہمارے گھر آکر بتیسی کی جانچ کرنی تھی۔ دو روز بعد اس نے ٹیلیفون پر اطلاع دی کہ تلاشِ بسیار کے بعد اس نے ہمارے باپ کی بتیسی کا سانچہ ڈھونڈھ نکالا ہے۔ اگلے روز اس نے ہمارے یہاں آنے کا پروگرام بنایا۔

ہمارا باپ رات میں جلد سونے کا عادی تھا۔ اس کے باوجود رات دیر گئے، ہم چوری چھپے، اُس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ حسبِ معمول صرف تہمد پہنے مسہری پر سو رہا تھا۔ اُس کے سرہانے ایک تپائی رکھی ہوئی تھی، تپائی پر بلوری پیالہ رکھا ہوا تھا، جو پانی سے بھرا ہوا تھا اور پیالے کی تہہ میں اس کی بتیسی رکھی ہوئی تھی۔ ہم وہ پیالہ اس کے کمرے سے اُٹھالائے۔

دندان ساز نے وہ بتیسی ہمارے باپ کے سانچے پر رکھدی۔ وہ ایک دوسرے میں یوں پیوست ہو گئے، گویا ایک جان دو قالب ہوں۔ دندان ساز نے محدب شیشے کی مدد سے انھیں ہر ہر زاویے سے پرکھا پھر بولا۔

"گوشے سے گوشہ مِلا ہوا ہے۔ کہیں کوئی خلاء نظر نہیں آتا۔ یہ بتیسی یقیناً اسی سانچے پر تیار کی گئی ہے۔ چوں کہ یہ سانچہ آپ کے باپ کا ہے، اس لیے یہ بتیسی یقیناً آپ کے باپ ہی کی ہے۔"

دندان ساز کے رخصت ہو جانے کے بعد، ہم تمام بہن بھائی انتہائی

خاموشی کے عالم میں پائیں باغ میں آ کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد چائے آ گئی۔ سب نے چسکیاں لے لے کر چائے پی۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ میں نے محسوس کیا کہ بہ ظاہر ہر کوئی مطمئن سا نظر آ رہا ہے، لیکن اندرونی طور پر دکھی ہے۔ جھجکتے ہوئے میں نے اپنے احساسات کا اظہار کر دیا۔

"آپ سب کو کوئی غم کھائے جا رہا ہے۔"

"غم ــــ؟ کیسا غم ــــ؟ ہمیں کوئی غم نہیں۔"

وہ یک زبان ہو کر بولے۔

میں نے کہا: "قدرت کرے کہ آپ ہر تشویش سے آزاد ہوں، کسی قسم کا کوئی غم نہ ہو۔ لیکن وہ کون سا اشارہ ہے کہ جو اُس کی موجودگی کا پتا دیتا ہے۔"

بڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ گویا سب اپنے اپنے دلوں کو ٹٹول ٹٹول کر جواب برآمد کرنے میں کوشاں ہوں۔ میں نے کہا:

"کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اپنے باپ سے علیٰحدگی اور بے گانگی کا دُکھ بھوگ رہے ہوں۔" ان کی جھکی ہوئی گردنوں میں ذرا سی جنبش ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے ویرانی ٹپک رہی تھی۔

جانے کب ہمارا باپ برآمدے کو پار کرتا پائیں باغ کا افقی حصّہ طے کرتا، ہمارے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس کی غیر متوقع آمد نے ہمیں بوکھلا دیا۔ دوسرے ہی لمحے ہم مستعد ہو کر بیٹھ گئے۔

اس نے کہنا شروع کیا۔

"تمہاری پریشانی کا باعث میں نہیں ہوں۔ میں تو وہی ہوں۔ تمہارا باپ۔ اعتقاد تمہارا اٹھ چکا ہے مجھ پر سے۔ بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ بپتا۔ یہ حیرانی۔ یہ وسوسے تمہارے اپنے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم اپنے آپ کو قصور وار ٹھہراؤ۔ مجھے الزام نہ دو۔"

ہم تمام بہن بھائیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"بوڑھے چپ ہو جا۔ زیادہ نہ بول۔ تو ہوتا کون ہے ہمیں اِس سن میں عقیدے اور ایمان کا درس دینے والا۔ آخر تیری بساط ہی کیا ہے۔ تو تو بہروپیا ہے۔ سوانگ بھر کر تو آج ہمیں جُل دے رہا ہے۔ تو دیے چلا جا۔"

یہ کہتے کہتے ہماری آواز کافی بلند ہو گئی۔

"پَر یاد رکھ، جس روز بھی ہمارا حقیقی باپ ہمارے ہاتھ لگا اس روز ٹھوکریں مار مار کر ہم تجھے اس چوکھٹ سے باہر کر دیں گے۔"

یہ سُن کر وہ کپکپانے لگا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ اپنے جسم کے گرد یوں لپیٹ لیے۔ گویا اس کا بدن ننگا ہو اور ہم اس کے ننگے بدن کو قمچیوں سے سُوت رہے ہوں۔

"چل ہٹ پرے۔"

ہماری ڈانٹ سُن کر وہ سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ پھر گردن جھکائے ہوئے، ڈگمگاتے قدموں سے مکان کے اندر چلا گیا۔

اس واقعے کے بعد ہمارے اور اس کے درمیان برابر فاصلہ قائم ہوتا گیا۔ اس کے باوجود ہم اُس کے وجود سے غافل نہ تھے۔ ہمارے دوستوں میں

ایک صحافی بھی تھا۔ ایک روز اپنے اخبار کے تعلق سے قارئین کی رائے معلوم کرتا ہوا وہ ہمارے یہاں بھی آ پہنچا۔ باتوں باتوں میں ہم نے اپنے باپ کی نسبت شبہے کا اظہار کر دیا۔ خلافِ توقع، اس معاملے میں اس نے ایسی دلچسپی دکھائی کہ اگلے ہی دن اس نے ہمارے باپ سے ملاقات کی ٹھان لی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ اس کا انٹرویو لے گا۔ تاریخ پیدائش، مقامِ پیدائش۔ مدرسہ، اسکول اور کالج کی تفصیل اس سے معلوم کرے گا۔ پھر پہلی ملازمت سے لے کر آخری ملازمت کے متعلق اس سے سوال پوچھے گا۔ اس کے مشاغل معلوم کرے گا۔ ہمارے دوست کو یقین تھا کہ کسی نہ کسی گوشے سے حقیقت خود بخود ابھر کر ہمارے سامنے چلی آئے گی۔

ہمارا باپ اس انٹرویو کے لیے آمادہ نہ ہوا دادی کے بڑے اصرار پر اُس نے ہمارے صحافی دوست سے چند منٹ گفتگو کی۔ اس نے اپنی زندگی کے بارے میں سب کچھ وہی بتایا کہ جس کا علم ہم پہلے سے رکھتے تھے۔ نہ کم نہ زیادہ۔ البتہ رواداری میں وہ یہ ضرور کہہ گیا کہ چوں کہ اس کا بچپن بڑی عسرت میں بسر ہوا تھا اس لیے غیر شعوری طور پر وہ جزرس واقع ہوا ہے۔

اس نے بتایا کہ اسکول میں یونیفارم کے طور پر پہننے کے لیے اُسے کینوس CANVAS کے جوتے مشکل سے نصیب ہوتے تھے۔ اپنے گھسے پٹے جوتے اسے اس حد تک پہننے پڑتے تھے کہ ان کے

کھلے ہوئے تلوں سے اس کے پنجے جھانکنے لگتے تھے۔ ان جھانکتے ہوئے پنجوں کو اوروں کی نگاہوں سے چھپانے کے لیے اُسے اپنی انگلیوں کو سختی سے بار بار بھینچنا پڑتا تھا۔

اگر وہ جزرس تھا۔ دیکھ بھال کر خرچ کرتا تھا۔ فضول خرچی سے پرہیز کرتا تھا تو اس کا یہ وصف ہمیں حال ہی میں کیوں معلوم ہوا۔ ہم تو بچپن سے دیکھتے آرہے ہیں کہ یہ ہاتھ کا کھلا تھا۔ آرام و آسائش کے تمام لوازمات اس نے مہیا کر رکھے تھے۔ عید تہوار کا کوئی موقع بغیر جشن منائے ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ عزیز و اقارب کی تواضع میں فیاضی سے خرچ کرتا۔ کفایت شعاری کا دھیان اس کے من میں کب آیا؟ اس وقت جب پرلوک سدھارنے کا سمے آیا۔ اور یہ جو لوگوں سے بیزار ہو کر ایک گوشے میں جا بیٹھا ہے۔ آخر اس میں کیا تک ہے نہ اچھا کھاتا ہے، نہ اچھا پہنتا ہے۔ نہ کہیں جاتا ہے اور نہ کسی کو اپنے قریب آنے دیتا ہے۔ یہ طور تو ہمارے باپ کے ہرگز نہ تھے۔ وہ بڑے خوش اخلاق، خوش گفتار۔ زندہ دل اور محفلوں کی جان تھے۔ اُن سے جو بھی ایک بار ملتا' دوبارہ ملنے کا خواہش مند ہوتا۔ لیکن یہ محرم کی پیدائش رونی صورت انسان ہمارا باپ کیوں کر ہو سکتا ہے۔

یہی باتیں ہم نے ایک روز اپنے بزرگ دوست کے گوش گزار کردیں۔ ہندی فلسفے سے متعلق ان کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ وہ آواگون پر یقین رکھتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ انسان اچھے کرموں

سے اپنی آتما کو رفعت وشان عطا کرتا ہے۔

انھوں نے فرمایا "مجھے لگتا ہے کہ تمہارے پتا کے شریر میں کسی بھرشٹ یوگی کی آتما ہے۔"

"بھرشٹ یوگی کی آتما۔"

ہم نے یک زبان ہو کر کہا۔ پھر قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

"باؤجی! بھرشٹ یوگی کسے کہتے ہیں؟"

انھوں نے فرمایا۔

"منشیہ دنیاداری سے بیزار ہو کر یوگی بن جاتا ہے۔ وہ اپنے من کو آجلہ سے ہٹا کر آخرت پر لگاتا ہے۔ اُسے یوگ اور مسلسل یوگ کرنا پڑتا ہے۔ ریاض اور تپ کے سہارے وہ اپنے نفس پر قابو پانے میں لگ جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ تپسیا کرتے کرتے یوگی کا من ان دنیاوی خواہشات کی جانب پھر مڑ جاتا ہے کہ جن کی تکمیل کا خیال اس کے مَن میں کسی کم سن بالک کی طرح مچلا کرتا تھا۔ اگر یوگی ایسے شدید جذبے پر قابو پالے تو کیا کہنے اور اگر اسے رام کرنے میں ناکام رہے تو یوگی کو اپنا یوگ تیاگ دینا پڑتا ہے۔ اس کے بعد خدانخواستہ یوگی کے جیون کا انت ہوجائے، تو وہ یوگی، بھرشٹ یوگی کہلاتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ قدرے توقف کے بعد فرمایا۔

"تمہارے پتا کے شریر میں بھی کسی بھرشٹ یوگی کی آتما نے پرویش کیا تھا۔ ان کے ابتدائی جیون میں وہ اپنی تمام ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کرتی

رہی اور جب سیر ہو چکی تو اس نے تمہارے پتا کو دوبارہ یوگی کا جیون اختیار کر لینے پر آمادہ کر لیا۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ باؤجی کی باتوں میں ان کے دھارمک عقیدے کا عمل دخل تھا۔ آواگون پر یقین رکھنے والے شخص کے لئے ان کے تجزیے میں معقولیت بھی تھی اور دلائل بھی تھے ابھی ہم کفر و ایمان کی کشمکش سے دوچار تھے کہ باؤجی نے سکوت پھر توڑا۔

"ان باتوں سے بھی تمہاری تسلی نہ ہوئی ہو تب بھی میری تم سے یہی پرارتھنا ہے کہ تم ان کے سادھارن جیون اور ان کی خلوت پسندی کو نامناسب ارتھ نہ پہناؤ اسے دوسرے رُخ سے یوں سمجھو کہ اب وہ بانِ پرست ہو گئے ہیں۔ انھوں نے ایک عرصے تک خانہ داری کی زندگی گزاری۔ پھر اُسے اپنی مرضی سے ترک کر دیا۔ ہمارے عقیدے کے مطابق وہ گرہست آشرم سے بانِ پرست آشرم میں داخل ہو چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصے کے بعد وہ سنیاس لے لیں گے۔ اور جس دن سے ان کے سنیاسی جیون کا آغاز ہوگا۔ اُسی دن سے وہ محض تمہارے کنبے کے فرد نہیں رہیں گے، بلکہ وہ بنی نوع انسان سے جا ملیں گے۔ جز کل میں مل کر فنا ہو جائے گا۔"

باؤجی کی باتوں سے ہمارے دلوں میں اس کی نسبت پیدا ہوئے شکوک رفع نہ ہوئے نہ ہی ان کے دور ہونے کا امکان نظر آیا۔

البتہ باؤجی کے دلائل نے ہمیں اپنے باپ کی مشکوک شخصیت کے لیئے ایک نیا تناظر عطا کیا۔ ہمیں کم از کم اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ اس بیگانے شخص کی جانب سے ہمیں کسی زیاں یا آزار کے پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ مزید یہ کہ ہم شعوری طور پر اس سے بے تعلقی اور بے اعتنائی برت رہے تھے۔ لیکن وہ قطعی طور پر ہم سے نہ تو کوئی تعلق رکھتا تھا۔ نہ کوئی لگاؤ ـــــ اُس نے اپنی تمام کائنات سمیٹ کر اپنے حجرے میں لے لی تھی۔ جس کے باہر اُس کی دانست میں ایک بے معنی سا خلا تھا۔

رفتہ رفتہ ہم اس کے عادی ہو گئے۔ ہمارے رویئے میں وہ پہلے کی سی شدّت نہ رہی۔ ہم اس سے برہم بھی نہ ہوتے تھے۔ اور نہ اُسے درشت و حقارت آمیز الفاظ سے مخاطب کرتے۔ البتہ برف کی ایک پتلی سی چادر ہم نے اپنے اور اس کے درمیان ضرور تان دی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی حرکات و سکنات کو اپنے شبہات کی اسکرین پر جانچنے کا مشغلہ ہم بدستور جاری رکھے ہوئے تھے۔

پوسٹ کارڈ

ریل کی سیٹی سُن کر لڑکا ہڑبڑا کر جاگا۔ کمرے میں مغربی کھڑکی سے چاند جھانک رہا تھا۔ رات کا آخری پہر تھا۔ سنّاٹے میں جھینگر کی سیٹی اور اُس کے پس منظر میں پٹریوں پر ریل کے دوڑنے کی آواز گونج رہی تھی۔ اس نے سرہانے رکھی ہوئی تپائی سے ٹارچ اٹھائی، سینے پر سے بلینکٹ سرکایا، بستر سے اٹھا، سلیپر پہنے، کرسی کی پشت پر پھیلی ہوئی شال اٹھا کر کاندھوں پر ڈالی، پھر ٹارچ کی روشنی میں دروازے کی کنڈی سرکائی اور کمرے سے باہر چلا آیا۔

اس کے کمرے کا دروازہ ایک وسیع ہال میں کھلتا تھا۔ ہال میں پُرانے طرز کا فرنیچر قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ کیبنٹ، صوفہ سیٹ، سینٹر ٹیبل، تپائیاں، کرسیاں، بُک ریکس، گل دان، سگریٹ کیس، ایش ٹریز... ان کے علاوہ دیواروں پر پینٹنگیں آویزاں تھیں۔ ہال کی مشرقی دیوار سے لگا ہوا ایک چھوٹا سا ٹیبل تھا، جس پر ریڈیو رکھا ہوا تھا۔ لڑکا اس ریڈیو کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے مکان کے ہر ہر فرنیچر سے لگاؤ تھا۔

ہال کی اُسی مشرقی دیوار پر ایک مصنوعی انسانی سَر آویزاں تھا، اسے اُس سَر سے بھی لگاؤ تھا۔

وہ اکثر کمرے میں بیٹھا اس سَر کے متعلق سوچا کرتا تھا۔ دراصل اس کی سوچ کا مُحرِّک، اس کے سرپرستوں کا، اس سر سے وابستہ جذبۂ عقیدت تھا۔ وہ سال میں دو بار، اُس سر کی نسبت، چند ایسی رسمیں انجام دیتے، جن کو دیکھ کر اُس کے ذہن میں، اس سَر سے ان کی عقیدت کا راز معلوم کرنے کا اشتیاق جاگتا، ساتھ ہی دل ہی دل میں اب اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس سر سے اس کی عقیدت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اُس نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہ اپنے سرپرستوں سے اُس سر کے متعلق پوچھے، لیکن ہر بار الفاظ اس کی نوکِ زبان پر آکر لوٹ گئے۔

اپنے معمول کے مُطابق لڑکے نے ریڈیو آن کر دیا۔ ڈائل کی سوئی ادھر اُدھر گھمائی، اُسے کوئی اسٹیشن نہ ملا۔ البتہ ریڈیو سٹ سے اُسے متعدد سگنل سنائی دیئے۔ وہ بڑی دیر تک ان سگنلوں کی پراسرار اشاریت کو اپنے معصوم ذہن سے سمجھنے میں کوشاں رہا۔

ایک دن ڈاکیہ اسے پارسل دے گیا۔ گتّے کے ڈبے میں بڑی نفاست سے کوئی چیز پیک تھی۔ اس نے ڈبّا کھولا۔ وہ ایک کتاب تھی، جو دور دراز واقع کسی قدیم شہر سے آئی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کتاب کے رُخ پر اسی مصنوعی انسانی سَر کی شبیہہ بنی ہوئی ہے۔ اس نے کتاب کے اوراق الٹے، اس توقع سے کہ کتاب میں مزید ایسی تصویریں

ہوں گی جن سے اس سر کے اسرار اُس پر کھلیں گے۔ چند صفحات پر تصویریں ضرور تھیں، لیکن وہ اُن سے اس سر کا کوئی تعلق نہ جوڑ پایا، کیونکہ چند تصویریں سکّوں کی تھیں جن پر بنے ہوئے نقش الگ سے بھی واضح کئے گئے تھے۔ چند صفحات پر عجیب وضع کے جانوروں کے عکس تھے۔ چار چھ صفحوں پر ایسی کشتیوں کے خاکے تھے جو زمانۂ قدیم میں ماہی گیری کے کام آتی ہوں گی۔ کشتیوں کے عکس بھی تھے،۔ جن پر کسی ناقابلِ فہم زبان میں تاریخیں اور واقعات درج تھے۔

اس نے وہ کتاب اپنے سرپرستوں کے حوالے نہ کی، بلکہ اُس کتاب کو اُس نے اپنی متعدد کتابوں کے ساتھ رکھ دیا۔ اپنے سرپرستوں کی نظر سے بچائے رکھنے کی خاطر اس نے اس کتاب پر اخبار کا گرد پوش چڑھا دیا۔ اب وہ کتاب اس کی دیگر کتابوں میں بظاہر روپوش تھی۔

وہ اپنے فرصت کے اوقات میں اس کی ورق گردانی کرتا۔ تو کبھی اُسے چھپا کر اپنے ساتھ باہر بھی لے جاتا۔ خاص طور پر سینی ٹوریم پارک میں! سینی ٹوریم پارک اُسے بے حد پسند تھا۔ پارک بہت وسیع اور کشادہ تھا، جس میں دیودار، نیم، برگد، پیپل اور چیڑ کے بیسیوں درخت اُگے ہوئے تھے اور ان کی چھاؤں میں بنچیں رکھی ہوئی تھیں۔ سہ پہر سے شام تک سینی ٹوریم کے مریض اور ان کے ملاقاتی بنچوں پر بیٹھ کر مطالعہ کرتے، چائے پیتے، خوش گپیاں کرتے۔ خلوت پسند عورتیں، سویٹر بنا کرتیں یا کشیدہ کاری کرتی ہوئی ماحول کا لطف لیتیں۔

وہ دُور، بنچ پر بیٹھا بیٹھا اس کتاب کے ورق الٹتا پلٹتا رہتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ مطالعہ میں مصروف کسی مریض کے پاس جائے اور اس مریض سے اس کتاب کا احوال معلوم کرے۔ لیکن کسی کے انہماک میں خلل ڈالنے کی اُسے ہمّت نہ ہوتی۔ وہ اپنے دل میں اضطراب دبائے بیٹھا رہتا۔

ایک روز، اس کے دو سرپرستوں میں سے ایک کو کسی چیز کی تلاش میں اس کے کمرے میں جانے اور اس کی کتابوں کا جائزہ لینے کا اتفاق ہوا۔ اس کتاب پر جوں ہی ان کی نظر پڑی، توں ہی اُنہوں نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔

شام کو جب وہ گھر لوٹا تو ان دونوں نے اس پر الزامات کا طومار باندھ دیا اور اسے سزا دینے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن جب اس نے انہیں اطمینان دلایا کہ اس نے وہ کتاب کسی اور کو نہیں دکھلائی ہے، نہ ہی اس کتاب کا اس نے کسی سے ذکر کیا ہے، تب کہیں جا کر وہ اپنے ارادے سے باز آئے۔

اب اُس کے لئے رات کی نیند اس قدر پر سکون نہ رہی تھی، جتنی پہلے تھی۔ وہ ریل کی کوک پر اٹھ بیٹھتا۔ ٹارچ ہاتھ میں لیتا، شال کندھوں پر ڈالتا اور دبے پاؤں مکان سے باہر چلا آتا۔ مکان کے پاس باغ میں نیم کا درخت تھا جس پر رات کے پرندے کا مستقل بسیرا تھا۔ اس نے دن میں بارہا نیم کی ہر ہر شاخ کا جائزہ لیا تھا، لیکن رات کا پرندہ اسے دن میں کبھی نظر نہ آیا تھا۔ البتہ رات کے وقت پرندہ نیم کی سب سے

نچلی شاخ پر موجود ہوتا اور گردن جھکا کر مراقبہ کیا کرتا۔

کھیتوں کے اس پار چمکیلی پٹریوں پر سیٹی بجاتی تیز رفتار سے گزرتی ہوئی ریل لڑکے کی روح میں ہنگامہ بپا کر دیتی۔ اُسے محسوس ہوتا کہ اس کے اندر ایک نامعلوم سا جہاں آباد ہے، جس کے کئی گوشے گنجان آباد شہروں کے سمان ہیں اور کئی علاقے گھنے جنگلوں کی طرح اَن بوجھے ہیں۔ اسے اپنے اس خیال پر حیرت ہوتی کہ ایک روز اسی ریل سے کوئی مسافر اترے گا جس کی آمد کی اطلاع اُسے ہوگی اور وہ مسافر اس مصنوعی انسانی سر سے مشابہ ہوگا۔

غیر ارادی طور پر اب وہ ڈاکیے کا منتظر رہنے لگا۔ سائیکل سوار ڈاکیہ اپنی آمد کی اطلاع گھنٹی بجا کر دیتا تو وہ دوڑ کر اپنے کمرے سے برآمدے میں آ پہنچتا اور اس کے دیئے ہوئے خطوں میں اپنے نام کا خط تلاش کرتا۔ اس کے سرپرستوں نے اس کے عادات و اطوار میں تبدیلی دیکھی۔ یوں بھی وہ اُن سے کم بولا کرتا تھا، اور بھی کم بولنے لگا۔ تینوں وقت کم کھانے لگا۔ کھیل کود یا کسی اور تفریح میں اس کا دل نہ لگتا۔ رات رات بھر اس کے کمرے کی بتی جلتی رہتی۔ وہ سحر خیزی کا عادی تھا، اب دیر سے جاگنے لگا۔ اس نے اپنے کمرے کی دیوار پر دونوں سمتوں سے آنے والی گاڑیوں کا ٹائم ٹیبل لگا لیا۔

ایک روز ڈاک سے اُسے ایک پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔ پوسٹ کارڈ پر کسی نے اپنی آمد کی اطلاع یقیناً دی تھی مگر مکتوب نگار نے اپنی

آمد کی تاریخ سے اُسے آگاہ نہیں کیا تھا۔ البتہ آمد کی تاریخ سے مستقبلِ قریب میں مطلع کرنے کا وعدہ تھا۔

اب وہ سہ پہر کو سینی ٹوریم پارک کے بجائے اسٹیشن جانے لگا اسٹیشن چھوٹا تھا۔ جس کے محض دو پلیٹ فارم تھے۔ وہ خالی پلیٹ فارم پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک چہل قدمی کرتا۔ کبھی رک کر ویران ویٹنگ روم کا جائزہ لیتا۔ ویٹنگ روم میں پڑی ہوئی لمبی لمبی آرام کرسیوں کو دیکھ کر اسے اپنے چھوٹے سے وجود کا شدید احساس ہوتا۔ اُسے ویٹنگ روم سے اٹھتی ہوئی بو سے اسپتال کے اطراف پھیلی ہوئی کراہت آمیز بُو کا احساس ہوتا اور جب اس کی نظر ہیٹ اسٹینڈ پر پڑتی تو ہیٹ اسٹینڈ کی کھونٹیوں پر اسے مڑی ہوئی انسانی انگلیوں کا گمان ہوتا۔

ریلوے سگنل بالخصوص اس کی توجّہ کا باعث ہوتے۔ یہ اُن کے قیام سے رکوع اور رکوع سے قیام کی حالت میں دوبارہ لوٹ آنے کے عمل کے متعلق سوچا کرتا۔ اُسے اسٹیشن نے سگنل کا میکینزم سمجھادیا تھا۔ وہ پلیٹ فارم کے آخری سرے پر جاکر کھڑا ہوجاتا اور وہاں سے دور واقع سگنل روم میں کام کرتے ہوئے آدمی کو دیکھا کرتا۔ اُسے وہ شخص بڑا پراسرار معلوم ہوتا، اتنا ہی پراسرار جتنا کہ مکان میں آویزاں اُسے وہ سر لگتا۔

اس کی موجودگی میں کبھی کبھار کوئی ریل تیزی سے گزرنے لگتی تو اس

کے اندر ہیجان سا بچ اٹھتا۔ ریل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی ہئیت اُسے بالکل مختلف معلوم ہوتی۔ وہ سمجھتا کہ وہ مومی پتلے ہیں، جنہیں انسانی لباس پہنا کر ایک نامعلوم اسٹیشن سے سوار کرا دیا گیا ہے اور ایک اَن جانے مقام پر وہ اتار لئے جائیں گے۔ اس کا جی چاہتا کہ اسٹیشن کے پورٹر کے ہاتھ میں سے سبز جھنڈی لے لے اور اس کے بجائے پورٹر کو سُرخ جھنڈی لہرانے کو کہے۔ وہ جانتا تھا کہ سُرخ جھنڈی کے دکھاتے ہی ریل رک جائے گی۔ ریل کے رُکتے ہی وہ اسکی جانب دوڑے گا۔ ڈبوں میں بیٹھے ہوئے مسافروں سے تعارف حاصل کرے گا اور اُن سے اُن کا احوال معلوم کرے گا۔ لیکن یہ ناممکن امر تھا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ یہ چھوٹا اسٹیشن ہے جس پر چوبیس گھنٹوں میں صرف دو ہی گاڑیاں رکتی ہیں اور وہ بھی رات گئے!

اُسے ایک واقعہ اچھی طرح یاد تھا۔ وہ اپنے کسی عزیز سے رات ہی میں بچھڑا تھا۔ اس شخص سے، جس کا سراپا اب اس کے ذہن سے محو تھا۔ اس کا کیا رشتہ تھا اسے یاد نہیں تھا۔ اُسے بس یہی یاد تھا کہ اس کے معصوم سے چہرے پر نیلی نیلی آنکھیں تھیں، وہ سدا مسکرایا کرتا تھا۔ وہ اُسے جنگلوں اور بیابانوں کی سیر کراتا، ندی کنارے کہانیاں سُناتا۔ ان دونوں نے دِن کے کئی کئی گھنٹے بلا مقصد ایک دوسرے کی سنگت میں گزارے تھے، جن کی خوشبو سے اس کا ذہن مہکا کرتا تھا۔ وہ شخص رات ہی کو جُدا ہوا تھا۔ اس کے ان ہی سرپرستوں نے اسے اگلی صبح بتایا

تھا کہ وہ رات کی ٹرین سے جا چکا ہے۔ وہ ایسا صدمہ تھا جسے آج تک اس نے اپنی جان سے لگائے رکھا تھا۔

عرصہ بیت گیا، پھر اس کے نام کوئی دوسرا پوسٹ کارڈ نہیں آیا۔ اب وہ سہ پہر کے بجائے رات کے وقت اسٹیشن جانے لگا۔ اپنے معمول کے مطابق رات کو ریل آتی، پلیٹ فارم پر رُکتی، وہ ایک سرے سے دوسرے تک ریل کے ہر ہر ڈبے کا جائزہ لیتا۔ اُسے محسوس ہوتا کہ ریل کا ہر ڈبہ مہر بند ہے۔ شاذ و نادر ہی سے کوئی ڈبہ کھلا ہوا ملتا۔ ڈبہ عموماً تاریک ہوتا۔ وہ اندر جھانکتا تو اسے سیٹوں پر سوئے ہوئے مسافروں کا گمان ہوتا۔ وہ ڈرتے ڈرتے جھکتے ڈبے کے اندر ٹارچ کی روشنی پھینکتا تو اسے اس ڈبے کو خالی پاکر انتہائی دُکھ ہوتا۔ ریل کے گزر جانے کے بعد، وہ تھکا تھکا سا گھر کو لوٹتا۔ پائیں باغ میں پہنچ کر حسبِ عادت وہ نیم کی ایک مخصوص شاخ پر نظر ڈالتا۔ رات کا پرندہ نیم کی اس شاخ پر گردن جھکائے مراقبے میں بیٹھا ہوتا۔

کچھ روز کے بعد اس کے سرپرستوں میں ایک ایسا بیمار ہوا کہ اس کی بیٹھ بستر سے جا لگی۔ دوسرا دن رات تیمارداری میں مصروف رہنے لگا۔ کبھی کبھار اس کے کمرے سے گریہ سنائی دیتا، بیمار کے حق میں گڑگڑا کر جب دوسرا دعائیں مانگتا تو اُسے بھی اپنا دل پگھلتا محسوس ہوتا۔ غیر دانستہ طور پر اس کی نگاہیں دیوار پہ آویزاں اُس سر کی جانب اُٹھ جاتیں، وہ آنکھیں جھپکائے بنا ٹکٹکی باندھے اُسے گھورتا ہوا محسوس ہوتا۔ اس کا جی چاہتا کہ

کسی سیاہ عینک سے اُس کی آنکھیں ڈھک دے۔
ایک رات اُس نے خواب دیکھا کہ ریل گاڑی اس کے مکان کے سامنے رُکی ہوئی ہے۔ ایک شخص اس ریل میں سے اتر کر اُن کے مکان میں داخل ہوتا ہے اور یکے بعد دیگرے گھر کا تمام مال و اسباب ریل میں رکھتا جاتا۔ آنِ واحد میں مکان خالی ہو جاتا ہے۔ ریل گاڑی چلی جاتی ہے۔ وہ ہال کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھا ہے۔ ہر سُو خاموشی ہے۔ خاموشی میں اُسے سِسکی سنائی دیتی ہے۔ وہ چو طرفہ نظریں دوڑاتا ہے۔ اس کی نگاہیں اوپر کو اُٹھ جاتی ہیں۔ وہ سر جوں کا توں قائم ہے۔ محض اس کی آنکھیں پُرنم ہیں۔
صبح ہوتے ہوتے وہ بیمار سر پرست چل بسا۔ اس کی میت ایک بوسیدہ سے ٹرک پر رکھی گئی۔ پاس پڑوس کے لوگوں نے متوفی کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا۔ اس ساری کارروائی کو دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ ایسا افسردہ ہوا کہ ریل اور اسٹیشن سے اس کی رہی سہی دلچسپی بھی ختم ہو گئی۔ اب وہ کمرے میں بیٹھا اُس سر کی بابت سوچا کرتا یا اُس کتاب کے اوراق الٹا کرتا۔ اس کی نگاہیں ان صفحوں پر اٹک جاتیں جن پر عجب وضع کے جانوروں، عہد پارینہ کی کشتیوں پر اسرار کتبوں اور سکّوں کے عکس تھے۔ اُسے محسوس ہوتا کہ وہ کسی اندھے غار میں قید ہے۔ اس کے ساتھی بکھر چکے ہیں۔ کوئی پرسان حال نہیں۔ اُسے یاد نہیں کہ وہ کب سے قید ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اُسے کس نے قید کر رکھا ہے۔ بس کبھی کبھار

اُسے کسی کتّے کا نوحہ سُنائی دیتا ہے، جس کو سُن کر اُسے احساس ہوتا کہ کتّا بھی اس کے ساتھ قید ہے اور جس اذیت سے وہ دوچار ہے، کتّا بھی اُسی اذیت کا شکار ہے۔

کچھ عرصے کے بعد اس کا دوسرا سرپرست بھی بستر سے جا لگا۔ اب وہ اس کے سرہانے بیٹھا اُس کی تیمارداری کرتا۔ کبھی کبھار اس پر ہذیان کا دورہ پڑتا۔ وہ بے معنی سی گفتگو کرتا:

"خالی مکان ... آرام گاہ ... کتاب ..."

اُس کیفیت میں وہ سر کی بندگی سے متعلق اُسے ہدایات دیتا یا رسومات ادا کرنے کی تاکید کرتا۔

ایک روز اُس کا دوسرا سرپرست بھی نیند سے نہ جاگا۔ وہی لوگ آئے وہی گاڑی بلوائی گئی۔ اسی احترام سے اُسے اُس گاڑی پر رکھا گیا اور حسبِ دستور بستی سے بہت دور اسی آرام گاہ میں لے جا کر انھوں نے متوفی کو لٹا دیا ...

چند روز بعد پھر اسے ایک پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔ لکھا تھا:

... افسوس ہے کہ مراسلت میں دیر ہوئی ....

مکتوب نگار نے آمد ... کی تاریخ لکھ دی تھی!!

سہ پہر کا تماشہ

کینوس پر ایک چہرہ بنا ہوا ہے۔ چہرہ مٹیالے رنگ سے بنا ہوا ہے۔

یہ چہرہ عام سا چہرہ ہے۔ جیسے آپ کا جیسے میرا۔ مجھے یہ چہرہ کچھ جانا پہچانا سا دکھائی دے رہا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے اسے کہاں دیکھا تھا؟

کس صوبے میں؟

کس شہر میں؟

کس قصبے میں؟

یاد آیا۔ کچھ روز پہلے جب شہر کے سب سے بارونق بازار سے گزر رہا تھا تو مجھے یہ چہرہ ٹی۔ وی کے فریموں میں سے جھانکتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ "ٹی۔ وی کے رنگوں میں اس کی آنکھیں زمرّدی اور ہونٹ یاقوتی نظر آرہے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اس کے

دانتوں کی جگہ موتی جڑے ہوں۔

مصوّر وہ تصویر غالباً مکمل کر چکا تھا۔ لہٰذا مصوّر نے وہ تصویر ایزل سے اتاری پھر اس کا رُخ پھیر کر اس تصویر کو اس نے دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا۔

مصوّر نے دوسرا کینوس ایزل پر چڑھایا، سگریٹ سلگائی اور کچھ سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے اس کا چہرہ تپنے لگا آنکھوں میں چتائیں جلنے لگیں۔ ہونٹ بھینچ گئے، جیسے اذیت ناک منظر اس کے ذہن میں گھوم رہے ہوں، جیسے ہرے بھرے درخت گرائے جا رہے ہوں۔ جیسے رنگ برنگے پرندوں کو اُدھیڑا جا رہا ہو۔ اسی کیفیت میں اس نے برش سنبھالا، دو چار رنگ ملائے اور لگا بڑے بڑے اسٹروک لگانے۔ پہلے تو کالے رنگ سے کوٹھری بنائی اس نے، تنگ و تاریک کوٹھری، اکھڑے ہوئے پلستر اور ٹوٹے ہوئے طاقوں والی کوٹھری۔ پھر اس نے دیوار سے ٹیک لگائے آدمی کا خاکہ بنایا۔ اس کے نقش ابھارے، پھر بڑی تیزی سے کینوس پر اِدھر اُدھر اسٹروک لگاتا رہا گویا تصویر کا نزول اس کے اختیار سے باہر ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے تصویر واضح ہو گئی۔ اس نے برش رکھ دیا اور پیچھے ہٹ کر تصویر کا جائزہ لینے لگا۔ گھٹنے پیٹ میں دیئے دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھا آدمی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شکستہ دروازے کو تک رہا تھا اس کا سینہ دھونکنی کی طرح پھولا ہوا تھا۔ مصوّر کا اضطراب اور بڑھا، بجلی کی سی تیزی سے اس نے دو چار اسٹروک اور

لگائے، یہاں وہاں تصویر کو چھوا، پھر تصویر ایزل سے اتار کر پہلی تصویر کے بازو میں رکھ دی۔

اس نے ایزل پر تیسرا کینوس چڑھایا اور اس تصویر کو بنانے کے لئے مختلف رنگ گھولنے لگا۔ شام ہو چلی تھی۔ ہر شخص بے اماں اور بے حال تھا۔ شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ ہر سو سوگوار کیفیت طاری تھی۔ جب ہر شخص بے اماں اور بے حال تھا تو پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ میں کچھ دیر اور تصویروں کو بنتا بگڑتا دیکھتا، کس طرح اپنی سوگواری دور کرتا؟ اندھیرے میں خطرے کا زیادہ امکان تھا۔ یہ سوچ کر میں وہاں سے رخصت ہوا۔

چند روز بعد جب کہ شہر پر ویسی ہی ماتمی فضا طاری تھی اس دوران میں مزید ملاقتیں واقع ہوئی تھیں۔ میں اپنی وحشت کو کم کرنے کی غرض سے چہل قدمی کے لئے نکل پڑا۔

دن دن بھر اپنے آپ کو چہار دیواری میں رکھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ محفوظ تو میں اپنے مکان میں بھی نہیں ہوں۔ وہ جب چاہیں ادھر کا رخ کر سکتے ہیں۔

جان جانی ہی ہے تو آزاد اور کھلی فضا میں کیوں نہ جائے اس گھٹی ہوئی فضا میں کیوں جائے۔؟

گھر سے باہر نکلنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ سڑکیں ویران پڑی ہیں اور چائے خانے سرد۔ تفریح گاہوں میں بھی خزاں اتر آئی ہے۔ میں سمندر

کے کنارے کنارے ٹہلتا ہوا میوزیم تک آیا۔ میوزیم کی قدیم عمارت کے احاطے کا چکر کاٹتے کاٹتے آرٹ گیلری پہنچا۔ گیلری کے داخلی دروازے پر ایک پوسٹر چسپاں تھا۔ جس کے ذریعے اطلاع دی گئی تھی کہ اس مصور کی تصویروں کی نمائش جاری ہے۔ میرے ذہن میں وہ تصویریں گھوم گئیں۔ زمردی آنکھوں والے شخص کی تصویر، گھٹنے پیٹ میں دیئے ہوئے دیوار سے لگے خوفزدہ آدمی کی تصویر اور وہ تصویر جسے بنانے کے لئے مصور رنگ گھول رہا تھا۔ لیکن میری روانگی کے وقت اس کی ابتداء نہیں ہوئی تھی۔

ان تصویروں کا خیال آتے ہی میرے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوئی، اچانک میں نے محسوس کیا کہ جیسے سینکڑوں کا مجمع مجھ پر جھپٹ پڑنے اور مجھ کو دبوچ لینے کے لئے عقب سے بڑھ رہا ہو اس ہیبت ناک خیال کے ذہن میں آتے ہی میں تیزی سے دوڑتا ہوا آرٹ گیلری کے وسیع ہال تک پہنچا، برفانی ہوا کے تیز جھونکے نے مجھے دہلیز ہی پر منجمد کر دیا۔ ہال نیم تاریک تھا وہ زمردی آنکھوں، موتی نما دانتوں اور یاقوتی ہونٹوں والا شخص کمرے کے وسط میں ٹہل رہا تھا اس کی نظریں دروازے کی طرف اٹھیں۔ یہاں مجھے پا کر وہ بری طرح چونکا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہوئے گویا اس کی خلوت میں میری غیر متوقع آمد نے اسے برہم کر دیا ہو۔

اس نے نہایت ہی نفرت اور غصے سے مجھے دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے

میرے جسم سے تمام کپڑے جھڑ گئے۔ میں شرم سے تھوڑا آگے جھکا۔ بڑی حقارت سے وہ مسکرایا۔ پھر اس کی نظریں میرے پیٹ پر چنگاریاں برسانے لگیں۔ پلک جھپکتے ہی میرے پیٹ سے دھواں اٹھنے لگا۔ کوئی آتش کدہ تھا جو اندر ہی اندر دہکنے لگا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ میری طرف بڑھا۔ میں اپنی شرم سے، اپنی بے بسی سے، اپنے جسم کی آگ سے یا اس کے سحر سے یوں ٹوٹا کہ پہلے تو میں اس کے قدموں میں دو زانوں ہوا، پھر دھیرے دھیرے میرا سر اس کے قدموں سے جا لگا۔

پتہ نہیں مجھے کب ہوش آیا؟ کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں شل ہو چکے تھے۔ بدن یوں ٹوٹ رہا تھا گویا دُھنک کر رکھ دیا گیا ہو۔ بڑی مشکل سے میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو سکا۔ لمحے مَن مَن بھر وزنی محسوس ہوئے؟ اور مجھے یاد آیا کہ ہزاروں کا مجمع مجھ پر جھپٹ پڑنے اور مجھے دبوچ لینے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا اور میں پناہ لینے کے لئے گیلری کے اندر چلا آیا تھا۔

پھر کیا ہوا تھا۔

وہ زمرّدی آنکھوں والا... میرے کپڑے... میرا پیٹ... میری ناتوانی... میرا سجدہ... پھر اندھیرا... میری بے ہوشی... اس کے بعد؟... اس کے بعد... وہ اپنے وجود میں سمٹنے لگا تھا۔ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگا تھا، وہ پیچھے ہٹتا گیا، ہٹتا گیا، یہاں تک وہ دیوار تک پہنچا اور اس فریم میں جا کر فٹ ہو گیا۔ یہ تمام واقعہ

فلیش بیک کی طرح میرے ذہن میں گھوم گیا۔

کچھ دیر بعد میری نقاہت میں افاقہ ہوا، میرے ذہن سے وہ ہیبت کچھ کم ہوئی۔ میں نے اپنے حواس کو قابو میں کیئے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور مصوّر کی اسی تصویر میں روپوش ہوا ہوگا۔ جسے مصوّر نے اس روز بنایا تھا۔ تصویر کا اسرار بڑھا اور میرا تجسس۔

میں اپنے خیال کو یقین میں بدلنے کی خاطر آگے بڑھا۔ وہ دو تصویریں مصوّر کی دیگر تین تصویروں سے جوڑ کر آویزاں کی گئی تھیں۔ پہلی تصویر اس زمردی آنکھوں، موتی نما دانتوں اور یاقوتی ہونٹوں والے شخص کی تھی۔ میں نے جھجکتے جھجکتے اسے چھُوا وہ چھپکلی کی پیٹھ کی طرح کھردری اور ٹھنڈی تھی۔ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ اس پر سے اٹھا لیا۔ دوسری تصویر اس سہمے ہوئے شخص کی تھی جو کوٹھری میں اکڑوں بیٹھا ہوا تھا اور اپنے حلقۂ چشم کے باہر نکلتے ہوئے دیدوں سے شکستہ دروازے کی کنڈی کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ تیسری تصویر میں سیاہ پس منظر میں سفید رنگ سے ہڈیوں کا انسانی پنجر بنایا گیا تھا جو اپنے جبڑے کھولے، دانت نکوسے اپنی ٹیڑھی میڑھی انگلیوں سے اناج کی بالیں تھامے ہوئے تھا۔ چوتھی تصویر میں سڑک پر ایک مجمع کو تتر بتر دکھایا گیا۔ جسے چند باوردی افراد اپنے ہاتھوں میں بندوقیں لئے ایک خاص سمت میں ہانک رہے تھے۔ پانچویں تصویر ملگجے سرخ رنگ سے بنائی گئی تھی۔ ٹوٹا ہوا دروازہ، کوٹھری کے فرش پر بہتا ہوا سیال۔ سیال پر چھوٹے

بڑے پیروں کے کئی نشان، فرش کے عین وسط میں ایک سر کٹی لاش،
اور لاش کا سر طاق میں رکھا ہوا۔
ان پانچوں تصویروں کا مصور نے ایک مشترکہ عنوان قائم کیا تھا۔

"سہ پہر کا تماشہ"

میں نڈھال قدموں سے چلتا ہوا، ہال کے باہر چلا آیا۔
سڑکیں بدستور ویران تھیں۔ چائے خانے سرد تھے۔ تفریح گاہوں
میں خزاں اتر آئی تھی۔

ذبیحہ

کُل چھ افراد پر مشتمل وہ مختصر سا قافلہ - جوں جوں ڈونگری گانو کے قریب ہوتا جاتا تھا سیدو کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی - اس کے سینے کے بہت اندر ایک عجیب سا سیال کروٹیں بدل رہا تھا اور اس کے اعصاب کسی بھیگے ہوئے قالین کی طرح وزنی ہوتے جا رہے تھے۔

وہ سوچ رہا تھا۔

اگلے پہر ہم بستی میں جا بیٹھیں گے۔

پروہت ذبیحے کو لائے گئے جانور کے درشن کو آگے بڑھے گا۔

گانو والے بھی اس کے پیچھے لپکیں گے۔

جوں ہی وہ جانور کو مردہ پائیں گے . . . . تب ؟

تب کیا ہوگا ؟

وہ انہیں کیوں کر یقین دلائے گا کہ جانور سفر کی صعوبتیں برداشت نہ کر سکا، صحرا کی تپش نے اس کے جسم کی نمی خشک کر دی،

کم سِن تھا، نازک جان تھا، دنیا سے جاتا رہا
لیکن... لیکن وہ تو اس کی موت کی ذمّہ داری اِسی کے سر دھر دیں گے۔
وہ پوچھیں گے کہ تمہیں کس مقصد سے بھیجا گیا تھا؟
تمہاری ذمّہ داری کیا تھی؟
محض جانور کی خریداری؟ کیا جانور کو بحفاظت بستی تک پہنچانا اس کے فرائض میں داخل نہ تھا؟
ان سوالوں کا وہ کیا جواب دے گا!!
واقعی یہ اس کا فرض تھا کہ وہ سفر کے صعوبتوں کا اندازہ کرتا۔ اُن کو ملحوظ رکھتے ہوئے حفاظتی تدبیریں اختیار کرتا۔ تدبیریں کرنے یا راہ کی دشواریوں سے اپنا بچاؤ کرنے سے آخر اسے کس نے روکا تھا؟
موسم شدید اور غیر موافق تھا، تو کہیں پڑاؤ ڈال دیتا۔
دو چار روز رُک کر آتا۔
لیکن جانور کو تو صحیح سالم پہنچاتا۔
یہ تو کوئی جواز نہ ہوا کہ دشوار سفر اور ناخوشگوار موسم کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی۔
گاؤں والے اس نہج پر سوچیں گے کہ سیدو اور رام دیال نے جانور ہی ڈھنگ کا نہ خریدا۔ روگی اور ناکارہ جانور، اونے پونے خرید کر چلے اور بستی والوں کی ہزاروں کی رقم غضب کر لی۔

تب... تب کیا ہوگا؟

سزا!

اور وہ بھی موت کی؟

موت کے تصور ہی سے اُن کے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوگئی۔

یہ ان کے سفر کا آخری پڑاؤ تھا۔ وہ پالکی جس میں وہ مقدس جانور مرا پڑا تھا، ان کے قریب ہی رکھی ہوئی تھی۔ وہ مزدور جو اس پالکی کو کوٹ مولراج سے اپنے شانوں پر لئے لئے یہاں تک آئے تھے۔ پچاس گز کے فاصلے پر سستا رہے تھے۔ رام دیال جو سیدو کا لنگوٹیا یار تھا، اور سیدو کے ساتھ اس نے بھی ذبیحہ کے لئے کوٹے مولراج سے جانور لانے کا بیڑا اٹھایا تھا، دیر سے دری پر لیٹا ہوا آسمان میں چکراتے ہوئے گِدھوں کو تاک رہا تھا اور غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھوں میں تھمے ہوئے رومال میں گانٹھوں پر گانٹھیں لگائے جا رہا تھا۔

وہ کچھ دیر بعد بولا!

کیا سوچ رہا ہے سیدو؟ کوئی تدبیر ہاتھ لگی؟

جب سیدو کی طرف سے اسے کوئی جواب نہیں ملا، تو وہ پھر بولا!

مجھے تو رہ رہ کر اس ہل کا خیال آتا ہے جس کا انگارہ اگلتا ہوا پھل ہماری رانوں میں ٹھنڈا کیا جائے گا۔

"ابے۔ تجھے تو ہمیشہ اپنی جان کی پڑی رہتی ہے، کبھی دوسروں کا بھی سوچا ہے تو نے؟" سیدو کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

رام دیال اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنا رخ سیدو کی جانب پھیر کر قدرے تیز لہجہ میں بولا!

دیکھ سیدو! تجھے اپنی جان کی پرواہ نہیں، نہ ہو۔ لیکن مجھے تو اپنی جان پیاری ہے۔ تُو تو جانتا ہی ہے کہ پنچ کیسے اکھڑ اور سر پھرے واقع ہوئے ہیں۔

جانوروں کو بلی چڑھاتے اور لوگوں کو اذیت ناک سزائیں دینے میں وہ کتنا مزہ لیتے ہیں تجھے یاد نہیں کہ پچھلی بار کرشن اور ہری کے ساتھ انھوں نے کیا سلوک کیا تھا؟ وہ تو جانور کو بستی تک پہنچا چکے تھے قربانی سے پہلے جانور نے دم توڑ دیا۔ تو ہی بتا سیدو کہ اس میں کرشن اور ہری کا کیا قصور تھا؟

ان ہی پنچوں کے حکم سے، دہکتا ہوا ہَل ان دونوں کی بیٹھک میں چلا دیا گیا!! وہ تو صاف کہتے ہیں کہ ہمارا انعام بھی بڑا ہوتا ہے اور سزا بھی کڑی ہوتی ہے۔ لوگ انعام کے لالچ میں آکر کام کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں۔ بیڑا اٹھانے کے کام کی کٹھنائی کا اندازہ نہیں کر پاتے، نتیجہ توقع کے خلاف نکلتا ہے۔ عبرتناک موت کی صورت میں!

کاش! میں اس موہ مایا کے چکر میں نہ پڑتا۔

عصر کا وقت تھا۔ خاموش فضا میں دم لے لے کر چلتی ہوئی ہوا کی آواز سنائی دے رہی تھی اس گمبھیر ماحول میں ان دونوں کے حوصلے پست ہوئے جا رہے تھے، سیدو اس مسئلے کے حل کی توقع رام دیال

سے قطعاً نہ رکھتا تھا اس کے برعکس رام دیال سیدو سے تمام امیدیں لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی اور وہ یہ کہ رام دیال سیدھا سادا گھر گرہستی والا آدمی تھا اور سیدو؟ اس کے برخلاف کائیاں اور شاطر اور تگڑم باز!!

یوں تو سیدو نے اپنے ذہن میں اس مصیبت سے چھٹکارے کا حل سوچ لیا تھا لیکن اسے شک تھا کہ وہ حل رام دیال کے لئے قابلِ قبول نہ ہوگا۔ دیر سے وہ اس حل کا متبادل سوچ رہا تھا۔ گھنٹہ بھر گزر چکا تھا اور اسے کوئی حل نہ سُوجھ پایا تھا۔ بادلِ ناخواستہ اس نے رام دیال کو اسی تدبیر سے آگاہ کردینے کا فیصلہ کیا۔

دیکھ یار! ایک تدبیر سوجھی ہے میں خود اس سے مطمئن نہیں ہوں! پھر بھی تیرے سامنے رکھتا ہوں تجھے قبول ہوگی تو ہی اس پر عمل کریں گے ورنہ کوئی اور اپائے سوچیں گے۔

رام دیال کی آنکھوں میں مسرت کی چمک پیدا ہوئی اور وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔

سیدو بولا۔

"کیا گانو والوں کو ہم باور کرا سکیں گے کہ جانور گرم موسم اور دشوار سفر کی وجہ سے مارا گیا؟"

رام دیال بولا۔

"نہیں، وہ ہمیں حفاظتی تدابیر اختیار نہ کرنے کا ذمّہ دار ٹھہرائینگے۔

ساتھ ہی گانو کے مذہبی اور سماجی معاملے میں غفلت برتنے کے جرم میں ہمیں موت کی سزا دیں گے ۔"

سیدو بولا۔

" اچھا ! تو اب یہ بتا رام دیال کہ کیا ہمارے پاس اتنا وقت ہے کہ ہم کوٹ مولراج پہنچ کر دوسرا جانور خرید کر لے آئیں ۔"

" نہیں . . . . کیوں کہ کل اماوس ہے ، قربانی لازمی ہے ۔"

رام دیال کا جواب سن کر سیدو کو تسلی ہوئی ۔ وہ قدرے رک کر بولا۔

" سن ___ وہ پالکی جن کہاروں نے اپنے شانوں پر اٹھا کر یہاں تک پہنچائی ہے ان کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے ؟"

" خیال ؟" رام دیال کچھ نہ سمجھتا ہوا بولا ۔

" یہی کہ وہ کون ہیں ؟ کیا کرتے ہیں ؟ ان کی کیا اہمیت ہے ؟"

" مزدور ہیں ۔ روزینہ مزدور ۔ اہمیت کیا ہو سکتی ہے ان کی ؟"

سیدو نے اطمینان کا سانس لیا اور بولا ۔

" ٹھیک سوچا ہے تو نے ۔ ویسے اس جواب کی تجھ سے امید نہ تھی ۔"

ان چار مزدوروں کو انہوں نے کوٹ مولراج میں کرائے پر حاصل کیا تھا ۔ کوٹ مولراج میں چار باڑے تھے ۔ ان باڑوں میں مختلف نسل کے جانور پالے جاتے تھے ، دور دراز کی بستیوں سے لوگ یہاں آتے اور اپنے اپنے مطلب اور اپنے اپنے مقصد کا جانور خرید کر لے جاتے ۔ مزدور ان جانوروں کو اپنے سروں پر اٹھائے اٹھائے ان کے ٹھکانوں پر پہنچا دیا کرتے تھے ۔

سیدو اور رام دیال جب کوٹ مولراج پہنچے تو اطراف کی بستیوں سے بھی بڑی تعداد میں لوگ جانوروں کی خریداری کے لئے آئے تھے باڑے والوں نے ڈیمانڈ دیکھ کر جانوروں کے دام بڑھا دیئے تھے۔ چونکہ کانے لولے، بیمار یا عیبی جانور کی قربانی سے مراد کے بر آنے کی توقع کم رہتی تھی اس لئے ہٹے کٹے، مستعد، نوک پلک سے درست جانور ہی ذبیحے کے کام میں لائے جاتے تھے جانور کو ناپ کر، اسے تول کر، اس کے دانتوں اور کھروں کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد ہی اس کا مول بھاؤ کیا جاتا تھا ان تمام باڑوں کی پشتوں سے روایت رہی تھی کہ وہ جانوروں کو غذائیت سے پُر خوراک کھلاتے، ان کے جسموں کی باقاعدگی سے مالش کرتے۔ انھیں گرم پانی سے نہلاتے اور انتہائی پاک وصاف مقام پر ان کی پرورش کیا کرتے تھے۔ ظاہر تھا کہ ان کا جانور درست و توانا ہوا کرتا تھا، البتہ فطری عیب لے کر پیدا ہونے والے جانوروں کے سلسلے میں وہ مجبور تھے۔

سیدو اور رام دیال نے تقریباً سو ڈیڑھ سو بھینسوں میں سے ایک ایسے بھینسے کو پسند کیا تھا کہ جس کے جسم کی کھال خرگوش کی طرح ملائم تھی۔ سینگ ہلال عید کے سے خم دار اور نوکیلے تھے۔ دانت جیسے مکئ کے دانے، کھُر جیسے قہوے پیالے۔ اس کا قد نہایت متناسب تھا اور آنکھوں میں اس کے ہرنوں کی سی وحشت رچی بسی تھی۔ جب انھوں نے اس کی منہ مانگی قیمت چکا دی تب باڑے کے مالک نے پوچھا۔

"کہاں کے ہو؟"

سیدو بولا۔ "ڈونگری گانو کے۔"

"اس بستی کے لوگ تو بڑے توہم پرست اور عقیدے کے کمزور ہیں ــــ کس کام سے لئے جا رہے ہو؟"

سیدو پھر بولا۔ قربانی کے لئے۔

"کوئی تہوار؟"

"نہیں۔"

"پھر؟"

"رسم"

"کیسی؟"

کوئی عمارت تعمیر ہو رہی ہے اس کی نیو میں اس کا خون دیا جائیگا

اپنا پلان جب سیدو رام دیال کو سمجھا چکا تو رام دیال نے "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق اسے مان لینے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

سیدو نے موقعہ غنیمت جان کر اور اس سے ڈر کر کہ کہیں اس کا ساتھی اپنا ارادہ نہ بدل دے، وہ اپنے پلان کو عملی شکل دینے میں لگ گیا۔ اس نے آواز دے کر ان سستاتے ہوئے مزدوروں کو بلایا اور بولا۔

"دیکھو بھائی! تمہارا کام یہاں پر ختم ہونا ہے۔ رسم کے مطابق بستی کے لوگ اس جانور کو آگے لے جائیں گے۔ یہ رہی تمہاری مزدوری۔"

پر مالک ! ہم تو جانور بستی تک پہنچا کر لوٹا کرتے ہیں۔

ان میں سے ایک مزدور جس نے پچھلے پڑاؤ پر نزع کی حالت میں جانور کو پانی پلایا تھا بولا۔

سیدو کے چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں ہوئے، اس کے باوجود وہ اپنی ناراضگی کو چھپاتے ہوئے بولا۔

"دیکھ بھائی ! یہ میں اپنی مرضی سے نہیں کر رہا ہوں۔ پروہت اور پنچ مل کر جو حکم دیتے ہیں وہ بجانے کی کوشش کرتا ہوں۔ چلو تھامو اپنی اپنی مزدوری۔"

رقم گن گن کر وہ ان مزدوروں کے ہاتھوں میں تھماتا گیا اور وہ دونوں مٹھی میں رقم لے لے کر اسے ماتھے سے لگاتے رہے۔

جب چوتھے مزدور نے بھی مزدوری لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے سیدو نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور بولا۔

"تم یہیں رکے رہو۔ بستی کے لوگ جب یہاں آ پہنچیں تب چلے جانا۔ ممکن ہے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے ہم کو۔"

وہ جھجکا۔

تب سیدو نے کہا

"ہم کچھ اور رقم تم کو دیں گے۔ ہمارے دھرم میں کسی مزدور کی مزدوری مارنا بڑا پاپ سمجھا جاتا ہے۔"

مزدور کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا بولا۔

"نہیں مالک! آپ کی سیوا تو ہمارا دھرم ہے۔ جب تک آپکی مرضی ہوگی میں تب تک رُکا رہوں گا۔"

اس نے اپنی آنٹی میں سے کچھ رقم نکال کر اپنے ساتھی کو دی اور درخواست کی کہ وہ پنساری کی دُکان سے نون۔ تیل۔ مرچ اور اناج خرید کر اس کے گھر پہنچا دے۔

اُن تینوں مزدوروں نے فرداً فرداً سیدو اور رام دیال کے چرن چھوئے اور اپنے ساتھی کو "جے جے رام جی کی" کہہ کر بستی کو چل پڑے۔

چند لمحوں بعد چوتھے مزدور کو جیسے کچھ یاد آگیا۔ وہ بآواز بلند بولا۔ "سنو۔۔۔ ماں سے کہنا کہ دو ایک روج میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ پھکر نہ کریں۔

انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے پیغام کی وصولی کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ گئے۔ چوتھا دور تک انہیں جاتا دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ ان کا وجود ریت کے ٹیلے کے پیچھے جا چھپا۔

اُن تینوں کو رخصت ہوئے گھنٹہ بھر بیت چکا تھا۔ چوتھا کچھ فاصلے پر انگوچھا بچھائے دونوں ہتھیلیوں کے تکیئے پر سو رہا تھا۔ سیدو نے مغرب میں نظر ڈالی۔ سورج تیس درجے کے زاویے پر آن پہنچا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اسے غروب ہونے میں آدھ گھنٹہ اور لگے گا۔

جب سورج غروب ہو چکا اور اندھیرے نے رینگ رینگ کر اس ویرانے میں اپنا ڈیرہ ڈال دیا تب سیدو نے قندیل جلائی اور مزدور کو جگایا۔ ان تینوں نے مشکیزے میں رکھے ہوئے پانی سے ہاتھ منہ دھوئے اور پھر توشے کے گرد بیٹھ گئے۔ اس میں سے انہوں نے پوریاں نکالیں اور آم کے آچار کے ساتھ کھانے لگے۔

مزدور نے مشکل سے دو نوالے کھائے ہوں گے کہ اس کا جی متلایا۔ جب انہوں نے اصرار کیا کہ وہ اور کھائے، تو وہ بولا

"سایب! میں نے بڑا بھینکر سپنا دیکھا ہے اتنا بھینکر کہ میری آتما اندر ہی اندر کانپ رہی ہے۔"

رام دیال نے اس کا شانہ تھپتھپایا، اور تسلی دی۔

"ہم دو دن سے اِس ویرانے میں سفر کر رہے ہیں۔ ہمیں ہر وقت کسی نہ کسی خطرے کا احساس رہتا ہے۔ مسلسل چوکنا رہنے سے ہمارے دماغ پر تناؤ پڑا ہے۔ تمہارا سپنا بھی اسی خوف کا نتیجہ ہے فکر کی کوئی بات نہیں۔"

یہ کہہ کر رام دیال نے پانی کا کٹورہ مزدور کی طرف بڑھادیا۔

کٹورہ ہاتھ میں لے کر مزدور بولا۔

"نہیں سایب! میں نے جو دیکھا اس کا سمبندھ مجھ سے ہوتا تو کوئی بات نہ تھی، مجھے تو لگتا ہے کہ میں نے جو کچھ بھی اپنے سپنے میں دیکھا ہے اس کا سمبندھ بہت سارے لوگوں سے ہے.... ساری بستی سے ہے۔"

سیدو جو بے تعلق سا نظر آرہا تھا اب اس معاملے میں دلچسپی لیتا ہوا بولا۔
"اپنا سپنا تو ہمیں بھی سُنا۔ پھر ہم تجھے بتائیں گے کہ تو صحیح سوچ رہا ہے یا غلط۔"

مزدور بولا۔
"سائیں میں دیکھتا ہوں کہ ایک بستی ہے اور وہ ویران پڑی ہے۔
اور سائیں!
ایک شیر اُس بستی کے گلی کوچوں میں ٹہل رہا ہے۔
اور کچھ کچھ وقفے بعد وہ کسی نہ کسی گھر، کسی نہ کسی دروازے پر جا کر کچھ کھوجتا ہے۔
اور سائیں!
میں سُنتا ہوں کہ دور بہت دور سے کسی بچے کی ہچکیاں لے لیکر رونے کی آواز آرہی ہے۔"

مزدور نے اپنا خواب اتنے رِقت آمیز لہجہ میں سنایا کہ اس کا ہر ہر لفظ رام دیال کے سینے میں اتر کر محفوظ ہو گیا۔ اسے مزدور سے یکایک ہمدردی پیدا ہو گئی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ سیدو کے مشورے سے اسے بھی گھر جانے کی اجازت دے دے کہ سیدو اپنی جگہ سے اٹھا، مزدور کی پشت پر پہنچا، کمر سے بندھی ہوئی رسی کھولی اور پھر اس نے آن واحد میں اس کا پھندہ مزدور کے گلے میں ڈال کر کس دیا۔ مزدور پھندے کی جکڑن سے اپنی گردن چھڑانے کی جان توڑ کوشش کرنے لگا۔

سیدو ڈپٹ کر بولا

"ابے بیٹھا بیٹھا کیا تماشہ دیکھ رہا ہے؟ اٹھ اور کس دے اس کے ہاتھ پاؤں۔" سیدو نے دوسری رسی کمر سے کھینچ کر رام دیال کی طرف اچھال دی۔

اس کے حکم نے رام دیال کی ڈولتی ہوئی سوچ پر لنگر کا کام کیا۔

کسی روبو کی طرح وہ اس رسی سے مزدور کے ہاتھ پاؤں کسنے لگا۔

چند ہی لمحوں بعد مزدور ایک گٹھری بنا ان کے قدموں میں پڑا تھا۔

وہ رہ رہ کر دہائی دے رہا تھا۔

"ارے سائب! مجھے چھوڑ دیجئے۔ مجھ سے کیا اپرادھ ہوا ہے؟ آپ نے مجھے کیوں باندھ دیا ہے؟"

رام دیال کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس سیدو بڑی مستقل مزاجی سے پلان کے دوسرے اقدام پر عمل کرنے کو مستعد نظر آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ان دونوں نے مل کر وہ مردہ جانور پالکی میں سے نکالا۔ اسے ٹیلے کے عقب میں لے گئے اور دفنا دیا۔ جب وہ اپنے اپنے ہاتھوں سے چمٹی ہوئی ریت اچھی طرح جھاڑ چکے تو سیدو نے مزدور کی طرف دیکھ کر رام دیال کو اشارہ کیا۔ جس طریقہ سے ان دونوں نے وہ مردہ جانور پالکی میں سے باہر نکالا تھا، اسی ترکیب سے انہوں نے اس مزدور کو اٹھا کر پالکی کے اندر ڈال دیا۔ مزدور کے گلے سے گھٹی گھٹی

چیخیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔

اب وہ شور و فغاں میں بدل گئیں۔

سیدو نے رام دیال کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے مزدور کی چیخ و پکار سے قدرے دور لے جاکر بولا۔

میرا کام ختم ہوا اور تیرا شروع۔

اب تو دوڑ لے۔ کسی بھی صورت میں دن چڑھے تک بستی والوں کو لے کر یہاں پہنچ۔ اور دھیان سے سُن۔ پروہت اور پنچوں کے سامنے بیان دیتے ہوئے بالکل نہ گھبرانا ورنہ انہیں شک ہو جائے گا اور ہم دونوں مارے جائیں گے۔

اپنی بات اتنی حیرت اور معصومیت سے کرنا کہ انہیں محسوس ہو کہ تو بذاتِ خود اس واقعے کو ناقابلِ یقین اور کسی جادوئی کہانی سے مختلف نہیں سمجھتا۔

ہم بچپن سے ایسے واقعات سنتے چلے آئے ہیں۔ بدروحیں اپنا آکار بدلنے میں اور لوگوں کی نگاہیں اپنے جادو سے مارنے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ ہر کوئی ان باتوں پر تھوڑا بہت یقین رکھتا ہے۔

بس اس بات کا خیال رکھنا کہ جانوروں کے ناموں کی ترتیب نہ بدلے۔

اچھا! اب یاد دہانی کے طور پر یہ بتا کہ پہلا روپ اس نے کاہے کا بدلہ؟

رام دیال نے کسی مُردے کی طرح جواب دیا۔

"بکری کا۔"

"دوسرا؟"

"خرگوش کا۔"

"تیسرا؟"

"چیتے کا۔" رام دیال کی آواز ڈوبتی رہی۔

جیتا رہ رام دیال۔ اور چوتھا آخری روپ؟

"کالے ناگ کا۔" رام دیال کی آواز گھُٹ کر رہ گئی۔

"شاباش" کہہ کر سیدو نے اس کے شانے تھپتھپائے اور بولا۔

"اس کے آگے کی کہانی انہیں میں سناؤں گا۔"

کچھ ہی دیر میں سیدو نے دوسری قندیل جلا کر رام دیال کے حوالے کر دی۔ اس قندیل کی روشنی میں رام دیال جب ڈونگری کا نوکی اور چلا تو اس نے دیکھا کہ اس کا سایہ ترچھا ہو کر ایک قدم آگے چل رہا ہے۔

شکار

وہ ماہی گیروں کی بستی تھی، سو پچاس جھونپڑوں پر مشتمل۔ ایک اونچا پہاڑ نصف دائرے کی شکل میں اس کی پشت پر یوں قائم تھا گویا اس کی نگہبانی کر رہا ہو۔ بستی کے سامنے ایک ندی بہتی تھی، جس کے اس پار گھنا جنگل تھا۔ جنگل کا راستہ مسدود تھا۔ خونخوار درندے اس جنگل میں ہمیشہ گھات میں رہا کرتے تھے۔ اور شکار کی تلاش میں کبھی کبھار ندی کا رخ بھی کیا کرتے تھے۔ بستی میں آنے جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ صرف پانی کے راستے بستی والوں کا دوسرے گاؤں اور قصبوں سے ناتا جڑا ہوا تھا۔ بستی والے ندی سے اپنی روزی روٹی حاصل کرتے، اچھے برے دنوں میں اسی کو یاد کرتے، اسی کے گن گاتے وہ ندی ان کی زندگی میں ماں کی حیثیت اختیار کر چکی تھی جس کی گود میں ان کے دکھ درد، ان کی خوشیاں ان کی آرزوئیں، ان کے خواب پلا کرتے تھے۔

پھر جیسے بستی پر کوئی سایہ پڑ گیا۔

ندی کے کنارے اُگے ہوئے درخت ڈھے گئے۔ کھیتوں سے اناج اور جڑی بوٹیاں عنقا ہوگئیں۔ وہ جھاڑیاں جو گدلے پانی میں اُگ آیا کرتی تھیں اوجھل ہوگئیں۔ جنگل چھٹ گیا، اشوک اور دیودار اُٹھ گئے۔ پھل اور پھول نابود ہوئے، شہد اور شراب کی کشید گی ختم ہوگئی۔ آہستہ آہستہ سبزہ زار فنا ہوگئے۔ مویشی بھوکوں مرنے لگے۔ بستی کے گھروں میں زندگی تنگ اور مختصر ہوتی گئی۔

ایک دن سارا گاؤں تعفّن اور بدبو سے بھبک اٹھا۔

گاؤں کے سارے ماہی گیر اپنے اپنے انگوچھوں سے ناک دبائے ندی پر جمع تھے جیسے انہیں سردی لگ گئی ہو۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے، آنکھوں میں ویرانی یوں اُتر آئی تھی کہ جیسے ابھی ابھی کسی عزیز کا کریا کرم کر کے لوٹے ہوں۔

دو روز پہلے کیتو کے جال میں دو ڈھائی کوڑی مری ہوئی مچھلیاں ایک ساتھ آگئیں۔ اگلے روز شترو کے جال میں مری ہوئی مچھلیاں! پھر تو کے!! ساری بستی میں کہرام مچ گیا۔ ندی کا پوتر پانی ایک ہی لمحے میں اَپوتر قرار دے دیا گیا!!! جس کا پینا کھانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ٹھہرا!

عورتوں نے کنوؤں کا رُخ کیا۔ بچوں اور چوپایوں کو ندی پر جانے سے روک دیا گیا۔ شہر سے چند لوگ آئے۔ انہوں نے پانی کے نمونے اور چند مری ہوئی مچھلیاں پولی تھین بیگوں میں ڈالیں اور چلے گئے۔ پھر گرام پنچایت کے مقرر کردہ ڈاکٹر پہنچے، انہوں نے بیماروں کی جانچ کی، ان

کی۔ تے ان کے بول و براز کے نمونے ساتھ لیے اور چل دیے ۔ شہر سے اور لوگ بھی پہنچے ۔ انہوں نے بستی والوں کے لیے روزانہ صاف پانی مہیا کرنے کا وعدہ کیا اور چلے گئے ۔

ندی کے کنارے اور ندی کے اندر پڑی ہوئی مچھلیاں سورج کی تمازت سے پکتی رہیں ۔ ان میں سڑاند پیدا ہوئی ۔ وہ گرمی سے پلپلی ہوئیں ، پھر خستہ ہو کر بُرادہ ہو گئیں ۔ آبی پرندوں نے ان کو اپنا چارہ بنایا پھر وہ اُڑنے سے محروم ہو گئے ۔ پر پھڑپھڑاتے وہ وہیں کے وہیں پھدکتے رہے " دور کھڑے بچے انہیں کنکریاں مار مار کر خوش ہوتے رہے ۔

اگلے روز ، گاؤں والے بڑی مستعدی اور سرگرمی سے بوڑھے شمبھو کو تلاش کر رہے تھے ، بوڑھا شمبھو مہا وِدوان تھا اسے چاروں وید حفظ تھے ۔ اسے سمرتیوں ، شاستریوں اور اُپ نشدوں کا بھی گیان تھا ۔ وہ گاؤں کی تمام سماجی اور مذہبی رسوم انجام دیتا ۔ وہ لوٹنے ٹوٹکے سے بھی واقف تھا اور ایسا وید تھا کہ جس کے ہاتھ میں شفا ہی شفا تھی ۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس کی عمر بڑی لمبی ہے ۔ کوئی اسے مہا بدھ کے زمانے کا آدمی کہتا تو کوئی کہتا یہ مست واہن راج میں گھاٹ کے درے سے اس بستی میں وارد ہوا تھا ۔ اور یہ بات تو سبھوں کی دیکھی بھالی تھی کہ اس کا سفید لنگوٹ ہمیشہ صاف ستھرا ہوا کرتا تھا ۔

بوڑھے شمبھو کو ڈھونڈتے ہوئے جب گاؤں والے پہاڑ پر پہنچے

توانہوں نے دیکھا کہ وہ ایک گپھا میں بیٹھا گیان دھیان میں مگن ہے۔
انہوں نے پوچھا۔
"شمبھو! ہم پر آفت آئی ہوئی ہے اور تو یہاں چین کے مزے لوٹ رہا ہے"
شمبھو بولا!
"پیڑ کو گھن لگ جاتا ہے تو وہ کاٹ دیا جاتا ہے" فصل کو سردی کھا جاتی ہے، تو جلا دی جاتی ہے۔ آدمی کو دیوی ہو جاتی ہے تو اسے اٹھا کر بستی کے باہر ڈال دیا جاتا ہے۔ زمانے سے ندی کی مچھلیاں بیمار چلی آ رہی تھیں، بھگوان نے اچھا کیا جو ان سب کو فنا کر دیا"
لیکن بھگوان نے مچھلیوں کی بھینٹ کیوں لی؟ وہ چاہتا تو ہم سے کوئی اور بھینٹ طلب کرتا"
شمبھو بولا!
"ممکن ہے وہ تمہیں ان سے دور رکھ کر کوئی اہم راز تم پر کھولنا چاہتا ہو.... ممکن ہے کہ وہ چاہتا ہو کہ تم جو صدیوں سے اس ندی کے غلام رہے ہو۔ اسی سے بندھے ہوئے ہو وہ تمہاری آزادی اور روزی روٹی کے لئے امکانات کا پتہ تمہیں دینا چاہتا ہو، تاکہ تمہارے جیون میں بہتری اور شب و روز میں تبدیلی واقع ہو"
شمبھو کچھ دیر کے لئے خاموش ہوا۔ پھر بولا!
"اور یہ نہ بھولو یہ عمل ایزدی ہے۔ ممکن ہے تمہاری نجات اسی

میں مضمر ہو تم جسے خسارا سمجھ بیٹھے ہو، وہی تمہارا نفع ہو۔ ندی نے بھینٹ دی یا ندی کی مچھلیاں بھینٹ چڑھا دی گئیں؟ اس کا جواب ہمیں بھوشیہ ہی میں ملے گا۔"

یہ کہہ کر بوڑھا شمبھو یوں خاموش ہو گیا گویا اپنے گیان دھیان میں پھر سے لگ گیا ہو۔

گاؤں والے شمبھو کے جواب سے غیر مطمئن تھے۔ وہ اپنے مسئلے کا حل مانگنے اس کے پاس پہنچے تھے اس نے انہیں فلسفے کا درس دیا تھا۔ شمبھو کی عالمانہ گفتگو ان کے حق میں بے نتیجہ ثابت ہوئی تھی۔ انہوں نے آپسی مشورے کے بعد مناسب سمجھا کہ بوڑھے شمبھو سے اپنے مسئلے کا دو ٹوک جواب مانگ لیں۔ تاکہ اس کی روشنی میں وہ اپنا اگلا قدم اٹھا سکیں۔

انہوں نے نہایت عجز و احترام کے ساتھ کہا۔

شمبھو! ہم ایسے اندھے غار میں داخل ہو چکے ہیں جس کے آگے ہمیں روشنی نظر نہیں آتی، تو ہمیں کوئی اُپائے سجھا کوئی دِشا دکھا۔ تو نے ہمیں صدیوں سے راہ دکھائی ہے اس بار بھی ہم تجھ ہی سے جیوتی مانگنے آئے ہیں۔"

بوڑھا شمبھو حسب معمول خاموش رہا۔ ان کا کہا گویا اس نے سنا ہی نہ ہو۔ پھر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

اب کی اماوس کو تم ایک انسانی لاش مہیا کرو۔ اسے گاؤں

کے چوک میں رکھو۔ ہر ایک گھر سے سات سات دانے سات اناج کے، سات سات پھل سات پھلوں کے، سات سات سبزیاں، سات سبزیوں کے لاش پر ڈالو۔ اس کے جسم کو سات رنگوں سے رنگو اور پھر اس کے پیٹ پر ننگی تلوار رکھو، اور اسے ایک ایسے جال میں لپیٹ دو کہ جس کو سات رنگوں کے ڈورے سے سات آدمیوں نے بُنا ہو۔ پھر وہ لاش ایک کشتی میں لٹا دو اور اس کشتی کو کھینچتے ہوئے اس مقام تک لے جاؤ جو پہاڑ کے انتہائی مغربی سرے پر واقع ہے۔ یہ وہی مقام ہے کہ جہاں وہ رہتا ہے وہی کہ جس کے کرودھ کا تم شکار ہوئے ہو۔ اس سے کہو کہ یہ اس کو بھینٹ ہے، وہ اسے قبول کرے اور تمہارے سر سے وہ عذاب اٹھالے۔"

رخصتی سے پہلے جب وہ اس کے چرن چھونے کو آگے بڑھے تو شمبھو گرجدار آواز میں بولا۔

"مجھ سے پرے رہو میرے قریب نہ آؤ۔ مجھے مہا روگ ہو چکا ہے۔ میرے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں جھڑ چکی ہیں۔" یہ سنتے ہی وہ جہاں تھے وہیں رک گئے۔

جب یہ بستی کو لوٹنے لگے تو انہیں ڈمرو کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں گھوں گھوں، گھیں گھیں کی مگر وہ آواز بھی سنائی دی اور وقفے وقفے سے تڑاخ تڑاخ کی بازگشت بھی! گھوں گھوں، گھیں گھیں۔۔۔ تڑاخ تڑاخ۔ انہوں نے دیکھا کہ بستی کے چوک

میں موٹے رنگین کپڑے کا لہنگا پہنا ہوا مرد کہ جس کے جسم کا اوپر کا حصہ ننگا تھا۔ عالم دیوانگی میں ایک لمبا چوڑا سونٹا ہوا میں گھما رہا تھا۔ سونٹا لہراتا ہوا آتا، اس کی پیٹھ پر پڑتا، تڑاخ کی جگر خراش آواز ہوتی پھر اس کی پیٹھ پر خون کی لکیر بن جاتی۔ اس کی ساتھی عورت عالمِ جنون میں سر پر کالی کی مورت اٹھائے رقص کر رہی تھی۔ رفتہ رفتہ تڑاخ تڑاخ کی آواز کا تواتر بڑھ گیا، عورت کی جنونی کیفیت اور بڑھ گئی گاؤں کے سارے لوگوں کے چہروں پر اندرونی دباؤ اور اذیت کی شدت جھلکنے لگی۔ ساری بستی پر کربناک ماحول چھا گیا۔

لکشمن کا جھونپڑا بستی کے سب سے آخری سرے پر واقع تھا۔ اسے بستی والے بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ اس کے پرکھوں میں سے کسی نے اس بڑی مچھلی کا شکار کیا تھا کہ جو نہ جانے کیوں کر بڑے سمندر سے اس ندی میں چلی آئی تھی اور ہفتوں بستی والوں کے جیون میں اس نے کہرام مچا رکھا تھا۔ اس بڑی مچھلی کا جبڑہ اب بھی لکشمن کی چھت سے بندھا ہوا تھا۔ جس میں ایک سالم بکرا بآسانی سما سکتا تھا۔ اس کے دانت آرے جیسے مشابہ تھے اور آنکھوں کے گڑھوں میں مور کے بڑے بڑے انڈے رکھے جا سکتے تھے۔ سنتے ہیں کہ مچھلی دو دن اور ایک رات کی تگ و دو کے بعد رام ہوئی تھی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پہاڑ کے مغربی سرے پر اب بھی ایسی مچھلیاں موجود ہیں لیکن وہ اس طرف کا رخ نہیں کرتیں۔

لکشمن کو اس کے دادا نے بتایا تھا کہ پہاڑ کے مغربی سرے سے صرف تین کوس کے فاصلے پر سمندر رہے۔

جال کی مرمّت کرتے ہوئے لکشمن سوچ رہا تھا، ساری مچھلیاں کیوں کر مر سکتی ہیں؟ ندی میں تو ہزاروں مچھلیاں تھیں۔ کیا سب کی سب مر گئیں؟ یہ کیسے ہو سکتا؟ اس ندی سے تو باپو نے بھی مچھلیاں پکڑی تھیں۔ باپو نے کہا تھا۔ ان کے باپو بھی اس ندی سے مچھلیاں پکڑا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ ان کے باپو نے، پھر ان کے باپو نے بھی اس ندی سے مچھلیاں پکڑی ہوں۔ اُن سب کا شمار کیا جائے تو تعداد ہزاروں کوڑیوں تک پہنچے گی۔ اس کا ننھا بیٹا شرد گھٹنوں چلتا ہوا اس کے پہلو میں آکر بیٹھ گیا " اب جال بُننے دیگا بھی کہ نہیں؟" سُنیتا نے گوبر سے پٹے ہوئے فرش پر چائے کا کٹورا رکھا۔ وہ شرد کو گود میں لے کر دہلیز پر جا کھڑی ہوئی۔ اس کے کان ڈمرو کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ چار بچے کم نہیں ہوتے اور وہ دو جو جاتے رہے، ان سبھوں نے اسے چوس چوس کر پھوک بنا ڈالا۔ جب آئی تھی تو گدرے آم کی سی تھی کچی کلیوں کی سی مہک تھی، اس کے جسم میں! سال چھ مہینے یہ اُسے قصبے میں مچھلی فروخت کرنے کو یہ سوچ کر نہیں بھیج پایا تھا۔ کہ وہ اسے جتنی ندیدہ نظروں سے دیکھتا ہے، اگر دوسرے بھی اس کی بیوی کو اسی نظروں سے دیکھیں گے تو کیا ہوگا۔؟

لکشمن نے ایک بڑے سے گھونٹ میں پیالہ خالی کر دیا۔ کان

سے اڑی ہوئی بیڑی نکالی، ہاتھ بڑھا کر چولہے میں سلگتی ہوئی لکڑی سے بیڑی جلائی اور لگا جلدی جلدی گانٹھ لگانے۔ اس کا ذہن پھر پیٹ کی یاترا پر نکل پڑا۔ مان لو کہ ساری کی ساری مچھلیاں مر چکی ہوں تو؟ تو کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر وہ اداس ہوگیا۔ اسی خیال کے ساتھ اُسے اپنی ماں کی چتا یاد آئی، تڑتڑاتی ہوئی لکڑیاں دھوئیں کا بادل، چنگاریاں اور پہاڑ کے آخری سرے میں ڈوبتا ہوا سورج! ماں کی دھیمی آواز دیئے کی نرم لو دیتی ہوئی آنکھیں، ہمیشہ دلاسا، حوصلہ اور دعائیں دیتی ہوئی ماں! گرم گرم بھات، مچھلی کا چٹ پٹا شوربہ، پاپڑ اور آم کا آچار! وہ چٹخارہ برسوں ہوئے یہ بھول چکا تھا.... باپو کے جیون میں بھی تو ایسا سمے آیا تھا۔ جب ندی مچھلیوں سے خالی ہوگئی تھی۔ گاؤں کے ماہی گیر ندی میں جال ڈالے گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ لیکن مچھلیاں تھیں کہ ہاتھ نہ آتی تھیں۔ شمبھو کہتا تھا کہ بھگوان کو بھوکا رکھ کر آپ اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے ... چڑھاوے چڑھاؤ، بلی دلواؤ اس کے سیوکوں کی سیوا کرو۔ پھر دیکھو۔ ان دنوں مانجھی پیسے والے ہوا کرتے تھے۔ ہر گھر میں سکوں سے بھری ہوئی دو دو تین تین ہانڈیاں دفن تھیں وہ خالی کر دی گئیں۔ پھر مینہ برسا، بجلی کڑکی، جل تھل ہوگیا۔ مچھلیاں امڈ امڈ کر ندی سے آنے لگی۔ اب کیا ہو؟ گاؤں میں کال پڑا ہے کون بھگوان کو پرسن کرنے کے لیے اتنا خرچ کر پائے گا؟

لکشمن کو اپنے خالہ زاد بھائی رام کا خیال آیا۔ وہ شہر میں

رکشا مز دور تھا۔ چار پانچ برس پہلے جب وہ گاؤں آیا تھا تو اس نے لکشمن کو شہر کی ایسی تصویر پیش کی کہ اس کا جی شہر دیکھنے کو مچل اٹھا دو چار سو روپے اپنی آنٹی میں باندھ کر لکشمن رام کے ساتھ شہر کو سدھارا جھونپڑے میں رہنا، فٹ پاتھ پر کھانا کھانا، کھلے میں سونا اور دن بھر سڑکیں ناپنا۔ ہفتے عشرے ہی میں لکشمن کا سرمایہ ختم ہو گیا۔ پھر رام اسے اپنے سیٹھ کے پاس لے گیا۔ سیٹھ نے اس کی پیٹھ پر کس کر گھونسہ مارا، شانے جھنجھوڑے بازو کی مچھلیاں دیکھیں اور پھر ایک نیا نویلا رکشا اس کے حوالے کیا۔ دن بھر رکشا کھینچنا، شام کو سفید گلی میں جانا، پاؤ ڈیڑھ پاؤ دارو سے جسم کی تکان دور کرنا۔۔۔۔ اور پھر رسہ کشی، کھینچ تان، مشکوں کی کسائی۔

لکشمن مردہ حالت میں گاؤں لوٹا۔ سونیتا نے اسے قسم دلائی کہ وہ پھر کبھی شہر جانے کا خیال اپنے دل میں نہیں لائے گا۔ بوڑھے شمبھو نے ہی اس کا علاج کیا۔ لکشمن دو ڈھائی مہینے کے عرصے میں پھر سے ندی پر شکار پر جانے کے قابل ہو گیا۔

سونیتا نے شرد کے ہاتھ میں جھنجھنا تھما دیا تھا۔ اور چند لوٹے پھوٹے لکڑی کے کھلونے بھی اس کے آگے رکھ دیئے تھے۔ وہ جھونپڑے کے کونے میں بیٹھا کھیل رہا تھا۔ سونیتا نے چولہے پر کھولتے ہوئے پانی میں چاول چھوڑ دیئے تھے۔ اور اب وہ سالن پکانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس نے لکشمن سے چھینکے میں سے سوکھے بومبل نکالنے کی درخواست

کی۔ لکشمن نے اپنے گھٹنوں پر پھیلا ہوا جال الگ کیا اور کھڑے ہو کر چھینکے
میں سے بوبلیل نکال کر سنیتا کو تھما دیے۔ اس اثنا میں اس کی نظر مچھلی
کے اس جبڑے پر پڑی جس کے دانت آرے کی طرح مڑے ہوئے اور
تیز تھے۔ وہ مچھلی کے سامنے ساکت کھڑا ہو گیا پل بھر کے لیے اسے
محسوس ہوا کہ ندی کے اندر بھونچال آگیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ لہروں کے بہاؤ
میں انتشار پیدا ہو گیا ہے اس کی کشتی زبردست ہچکولے لینے لگی ہے
اور یکایک مچھلی کا سیاہی مائل سر سطح آب پر نمودار ہوا ہے!

کچھ دیر بعد وہ اور سنیتا بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ شرد لکشمن کی گود میں
تھا اور پکے ہوئے بونبل کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں۔ لکشمن محسوس کر رہا
تھا کہ نوالہ مٹی کی رکابی میں سے اٹھا کر منہ میں رکھنے میں اسے کبھی اتنی
دشواری نہیں ہوئی تھی کہ جتنی دشواری اسے آج ہو رہی ہے پہلے اور
دوسرے اور پھر تیسرے نوالے کا درمیانی وقفہ بڑھتا رہا، بڑھتا ہی رہا۔

شام کو چوپال میں بوڑھے شمبھو کے مشورے سے تمام
گاؤں والوں کو آگاہ کر دیا گیا۔ انگلیوں پر دن گن کر اماوس کی تاریخ
متعین کر لی گئی۔ چھٹے دن اماوس تھی۔ پنچایت نے گیہوں، چاول
جوار، باجرہ۔ مکئی، چنا اور ناگلی بطور سات اناج، آلو، پیاز، ٹماٹر،
تُرا، بھنڈی، بینگن اور مٹر بطور سات سبزیاں، بیر، پیرو، پپیتا، کیلا،
سنترہ، موسمی اور آم بطور پھل رسم کے لیے تجویز کیے۔ ہر گھر سے
ایک مقرر کردہ رقم وصول کی گئی تاکہ قصبے میں جا کر یہ اجناس خریدی

جاسکیں اور اماوس کی سات میں اس رسم کی تکمیل باقاعدگی سے ہو جس کی تکمیل کا بوڑھے شمبھو نے مشورہ دیا تھا۔ سات رنگ کے ڈورے سے جال بننے کی ذمہ داری سات بھائیوں کو سونپ دی گئی تھی سات رنگ کا سفوف بھی قصبے سے خرید کر لانے کی بات ہو چکی تھی۔

لیکن اب مسئلہ لاش کا تھا! کہ لاش کیونکر مہیا کی جائے۔

اس رات چوپال میں بیٹھے ہوئے لوگ گاؤں کے مکینوں کا جائزہ اپنے اپنے ذہنوں میں لے رہے تھے کہ کہیں کسی گھر میں کوئی بوڑھا، کوئی زچہ، کوئی بیمار، کوئی زخمی تو موجود نہیں کہ جس کے چند روز میں مرنے کی توقع کی جا سکے۔

جب لوٹتے ہوئے چاند کا چھوٹا سا ٹکڑا پہاڑ کے مغربی سرے پر پہنچ گیا تو لکشمن نے اندھیرے میں سنیتا کو جگا کر اپنی روانگی کی اطلاع دی وہ اس سے چمٹ گئی۔ وہ اسے جانے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی، کیونکہ مچھیروں کی یہ روایت تھی کہ شکار پر جانے والے کو روکنا بدشگونی کی علامت ہے۔ سمندر میں باڑھ آئی ہوئی ہو یا ندی میں طغیانی، روکنا ہر حالت میں برا سمجھا جاتا تھا۔

شرو کے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اس نے اپنا توشہ اٹھایا۔ چپو بغل میں داب اور جال کاندھے پر ڈالے ندی کی جانب چل پڑا۔ سنیتا دہلیز میں اپنی ساری کا پلو منہ میں دبائے روتی بھبکتی اسے جاتا دیکھتی رہی۔ سارے میں مری ہوئی مچھلیوں کی سڑاند حسب معمول پھیلی ہوئی تھی ندی پر پہنچ کر

لکشمن نے اپنی ناؤ کھولی اس دوران میں کئی مری ہوئی مچھلیاں اس کے تلووں سے مس ہوئیں لکشمن کا جی متلایا۔ ٹوٹے چاند کے چھوٹے سے ٹکڑے کی روشنی میں ندی کسی مہیب آسا بلا کی طرح بے چینی سے کروٹیں بدل رہی ہیں۔ کشتی کا رُخ پہاڑ کے مغربی سرے کی جانب موڑ کر لکشمن نچے تلے انداز میں چپّو چلانے لگا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج مغربی سرے پر پہنچ کر وہ سمندر میں شکار کرے گا۔ سمندر کے تصوّر سے اس کے پیٹ میں مروڑ پیدا ہونے لگا اور دل حلق کی جانب گولے کی طرح لڑھکنے لگا۔

بوڑھے شمبھو کو اب اپنے آپ پر بھی اعتبار کم رہ گیا تھا۔ اس نے بستی والوں کو ان کے مسئلے کا حل تو تجویز کر دیا تھا۔ لیکن وہ خود اس تجویز کردہ حل سے مطمئن نہیں تھا۔ جب سے مہا روگ اس سے جونک کی طرح آکر چمٹا تھا تب سے اسے اپنی وِدّیا میں تھوڑی سی کھوٹ کا احساس ہونے لگا تھا۔ یہ اعتبار اور نہ اعتبار کی کیفیت، یہ شک اور یقین کے درمیان میں معلق آتما اسے مضطرب کیے ہوئے تھی اس نے وید اور شاستروں سے رجوع کیا تھا، ان میں لکھے ہوئے قول تحریریں اسے متاثر تو بہت کرتے تھے لیکن ان کے سو فیصدی شافی ہونے کا یقین اسے کم تھا جس طرح اسے اپنی بیماری کا کوئی مجرب نسخہ ہاتھ نہیں لگا تھا، اسی طرح وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسی بلا ہے جس نے ندی کی تمام مچھلیوں کی آتما سلب اور گاؤں والوں کے منہ سے

نوالا چھین لیا۔ کلجگ کے آثار نمایاں تھے۔ اور بوڑھے شمبھو کا ضمیر اس سے نبرد آزما تھا۔

گپھا میں بیٹھے بیٹھے بوڑھے شمبھو کو رات اور دن میں تمیز کرنا دشوار تھا۔ اس کے باوجود گپھا کی دراڑوں میں پناہ گزیں پرندوں کی آمد و رفت سے وقت کا اندازہ کر لیا کرتا تھا۔ وہ نیک دلی سے سوچ رہا تھا کہ گاؤں والوں کو بتایا ہوا اس کا ٹوٹکا کسی وجہ سے ناکام ہو گیا تو کیا ہو گا۔؟ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا مہاروگ نے یوں بھی اسے اس قابل نہ رکھا تھا اس کے باوجود اس ٹوٹکے کی کامیابی ہی میں اس کی نجات تھی۔ ٹوٹکے کا کامیاب ہونا ضروری تھا ورنہ اس بلا کو تسخیر کرنے کا اس کے پاس کوئی اور علم نہیں تھا۔

شمبھو اٹھا اور بمشکل چلتا ہوا گپھا کے دہانے پر آیا دور بہت دور غالباً پہاڑ کے مغربی سرے پر لومڑیاں رو رہی تھیں۔ جونہی اس نے گپھا سے قدم باہر نکالا ایک کالا ناگ جھاڑیوں میں رینگ گیا۔ شمبھو نے پہاڑی پر سے بستی پر نظر ڈالی۔ وہ گاؤں کے چوک میں اس جلوس کو دیکھنے کا تمنائی تھا۔ جس کی تیاریاں اس کے حساب سے کئی روز سے ہو رہی تھیں۔ پل بھر کے لئے اسے خیال آیا کہ گاؤں والوں نے لاش کہاں سے حاصل کی ہو گی؟ بستی میں کس کی میت ہوئی ہو گی؟ اور اگر کسی کا دیہانت نہیں ہوا ہو گا تو

کیا لاش کا پربندھ انہوں نے کر لیا ہوگا ؟ دوسرے گاؤں یا قصبے سے ؟
کس قبرستان یا مردہ گھر سے لاش منگوائی گئی ہوگی ؟ شمبھو کو مایوسی
ہوئی بستی تاریکی کی سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ اکا دکا جھونپڑوں میں
دیئے ٹمٹمار ہے تھے۔ شمبھو کو پھر خیال آیا کہیں ایسا تو نہیں کہ وقت
کافی گذر چکا ہو بستی والے رسم انجام دے چکے ہوں۔ اور اب چین کی
نیند سو رہے ہوں لیکن یہ کیونکر ممکن تھا۔ رسم بغیر ڈھول تاشے کے کیسے
انجام دی گئی ہوگی ؟ کیا اب کی بار بستی والوں نے رسم میں تصرف کیا
ہوگا ؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ رسم سوگوار تھی۔ شادمانی کی نہیں تھی اس
لئے انہوں نے سازوں کے استعمال سے پرہیز کیا ہو۔

شمبھو کے اندر کا آدمی، شمبھو پر حاوی ہونے میں بڑی دیر سے
مصروف تھا۔ موقعہ پاکر اس نے شمبھو کو پٹ کر دیا۔ " اب تو کسی کو منہ
دکھانے کے قابل نہ رہا۔ شمبھو۔ انہوں نے تیری ہدایت پر سرے
سے عمل ہی نہیں کیا وہ سب تیرے فرسودہ علم اور تیری تدبیروں کے
غیر موثر ہونے سے واقف ہو چکے ہیں اب تو انہیں مزید اندھیرے میں نہیں
رکھ سکتا، تیرا بھرم ٹوٹ چکا "

شمبھو بکھرے دل سے اپنے آپ کو تسلی دیتا ہوا جلدی جلدی
پہاڑی سے نیچے اترنے لگا پیروں کی انگلیوں کے جھڑ جانے سے، اسے
زمین پر پیر جما کر چلنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ گرتا پڑتا بستی
میں پہنچا۔ راہ میں پڑنے والے پہلے جھونپڑے پر اس نے آواز دی۔

"شنکر"

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔

اس نے دوسرے جھونپڑے پر آواز دی

"بھیمو ۔۔۔۔ کوئی جواب نہیں ۔۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے"

اس نے تیسرے جھونپڑے پر آواز دی

"رامو"

خاموشی !!!

شمبھو کے اندر بیٹھے ہوئے آدمی نے قہقہہ لگایا، "دیکھ مورکھ! میں نہ کہتا تھا یہ تیری آواز بھی سننے کے روادار نہیں ہیں، جا بھاگ جا اس بستی سے اپنا منہ کالا کر، کہیں جا کر مر کھپ جا"

شمبھو پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

"شنکر، بھیمو، رامو، بھالو، کیتو، وتو ۔۔۔۔ کہاں مر گئے؟ سانپ سونگھ گیا ہے تمہیں؟ اٹھو، دیکھو، رات مر رہی ہے، اب بھی موقع ہے رسم انجام دے لو"

بستی پر خاموشی چھائی رہی۔ شمبھو خوفزدہ ہو گیا۔ ایسا خوفزدہ وہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا ایسی کیفیت اس پر کبھی طاری نہیں ہوئی تھی۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا ۔۔۔۔ اندھادھند بھاگتا ہی رہا۔

ندی کے کنارے پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور اس کے لبوں پر نمی کا نمکین ذائقہ تھا کچھ دیر بعد اسے پانی

میں چپّو کھینے کی آواز آئی - اس کے کان کھڑے ہو گئے - وہ آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا . . . . . ایک سایہ کشتی سے اترا، اس نے مچھلیوں سے بھرا ہوا جال کندھے پر ڈالا۔ چپّو بغل میں دبائے اور بستی کی اور روانہ ہوا۔

اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے؟ اور اس کا جال اتنا وزنی کیوں ہے کہ اسے بار بار اس کا بوجھ ایک شانے سے دوسرے شانے پر منتقل کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔

" او بھائی ذرا سنو "

سایہ رک گیا۔ شمبھو اس کے قریب گیا۔

کون ہو تم؟ کہاں سے آرہے ہو؟

" میں . . . " میں . . . . لکشمن ہوں " . . . . اور تم "

میں . . . . میں . . . . شمبھو ہوں "

وہ آنکھیں پھاڑے ایک دوسرے کو اندھیرے میں گھورتے رہے۔

" تم . . . . تم . . . . وہی تو لکشمن نہیں جو پچھلے یگ میں بڑے سمندر میں مچھلیاں پکڑنے گئے تھے "

" پچھلا یگ . . . . کون سا پچھلا یگ؟ "

" جب بستی میں پرندوں نے آگ برسائی تھی، سب کچھ جل گیا تھا، ندی کا پانی بھی تم اس یگ میں بستی سے گئے تھے، صرف تم "

" تم کیا کہہ رہے ہو؟ میری سمجھ میں نہیں آرہا؟ مجھے گھر جانے دو

میرے شانوں پر بھاری بوجھ ہے۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں، آرام کرنا چاہتا ہوں"

"کون سا گھر؟ کس کا گھر؟ بستی میں اب نہ کوئی گھر رہا نہ گرہستی! سب کچھ فنا ہو چکا ہے"

"کیا بکتے ہو۔ ہوش میں تو ہو؟"

"میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں، جا کر دیکھ لو، ساری بستی شہر خموشاں میں بدل چکی ہے ۔۔۔ ہر جھونپڑے میں لاشیں پڑی ہیں، لاشیں صرف لاشیں"

یہ سن کر لکشمن بڑبڑایا۔

"میں کسی غلط مقام پر آپہنچا ہوں ۔۔۔ مردوں کی بستی سے میرا کیا تعلق؟"

الٹے قدموں لکشمن ندی کو واپس ہوا۔

مچھلیوں سے بھرا ہوا جال اس نے کشتی میں رکھا۔ پھر خود کشتی پر سوار ہو گیا۔ دیر تک شمبھو کو پانی میں چپو کھینے کی آواز سنائی دیتی رہی۔

اور پھر ۔۔۔ مستقل خاموشی چھا گئی۔

پرندے کا سایہ

ماہرِ نفسیات عزیز شریفی نے بیگم فردوس کے کیس ہسٹری کی فائیل اٹھائی اور کیس کا مطالعہ کرنے لگے۔ کئی دنوں سے یہ کیس اُن کے زیرِ مشاہدہ تھا۔ لہٰذا بیگم فردوس کی شخصیت کے بعض پہلو شریفی کی نگاہ میں آچکے تھے۔ بادی النظر میں بیگم فردوس کا کیس پیچیدہ نہ تھا۔ مگر اس قدر ہموار بھی نہ تھا کہ غور و خوض کیے بنا ہی شریفی کی گرفت میں آجاتا۔ بیگم فردوس ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ لہٰذا وہ اپنے مسئلے کو خوب سمجھتی تھیں کہ بغیر کسی ماہرِ نفسیات کی مدد کے، اُن کی ذہنی گتھی سُلجھ نہ پائے گی۔ چنانچہ اِس بنا پر، انہوں نے شریفی سے بذاتِ خود رابطہ قائم کیا تھا۔

بیگم فردوس کو شکایت یہ تھی کہ دو دو، چار چار روز کے وقفے سے انہیں ایک خواب بار بار آیا کرتا تھا۔ جس کسی رات کو خواب انہیں دکھائی دیتا، اس کی صبح بیگم فردوس کے لئے شامِ غریباں ہوں۔

افسردگی کا یہ عالم ہوتا کہ وہ گھنٹوں گُم صُم رہا کرتیں۔ نہ کھائیں نہ پیتیں! یہاں تک کہ شام ہو جاتی، اِدھر شام ہوتی، اُدھر ان پر گریہ طاری ہوتا۔ اُس کا دباؤ اس قدر شدید ہوتا کہ وہ اس کی تاب نہ لا پاتیں اور بے ہوش ہو جاتیں۔ مگر گھنٹے دو گھنٹے کے بعد جب انہیں ہوش آتا تو بتدریج طور پر اُن کی ذہنی کیفیت نارمل ہو چکی ہوتی۔

اِس عرصے میں شریفی نے بیگم فردوس سے اس خواب کی جملہ کیفیات معلوم کرنے کی بہتیری کوشش کی تھی، مگر انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو پائی تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ بیگم فردوس کی زبان سے ابھی خواب کے ابتدائی جملے ہی ادا ہوتے کہ وہ نَروس ہونے لگتیں۔ مزید کوشش کرتیں تو ان کا دل بھر آتا، جس کے نتیجے میں اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ جاتا۔ شریفی کو یقین تھا کہ اگر خواب کی ترسیل اُن تک ہو چکے گی، تو وہ اُس کی نفسیاتی تعبیر کر لیں گے، اور جب وہ بیگم فردوس کو تحلیلِ نفس کے عمل سے گزار رہے ہوں گے۔ اُس وقت اِس تعبیر کی معرفت وہ اُنہیں اُس خواب کے قنوطی اثر سے نکال لیں گے۔ چوں کہ شریفی کی اِس قبیل کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں لہٰذا انہوں نے بیگم فردوس کو اپنا خواب تحریر کرنے کا مشورہ دیا تھا، ساتھ ہی انہوں نے انہیں یہ ہدایت بھی دی تھی کہ وہ اپنا خواب بے کم و کاست لکھیں۔ اِس وقت بیگم فردوس کا خواب تحریری صورت میں شریفی کے ہاتھوں

میں تھا، جس کی ابتدا یوں ہوتی تھی :
جزیرہ پر گھرے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں، ہوائیں سیٹیاں بجاتی چل رہی ہیں۔
"سنو!"
میں چونکتی ہوں، یہ آواز کہاں سے آئی، میرا وہم تو نہیں!
"ادھر دیکھو، میں بول رہا ہوں۔"
میں آواز کے رُخ دیکھتی ہوں، صوفے پر بیٹھا ہوا پرندہ اپنی ننھی منی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔
"تم..؟ تم کون ہو؟" میں سہم کر پوچھتی ہوں۔
"میں... میں ایک معمولی سا پرندہ ہوں، اور تمہارا ممنون ہوں۔"
دو روز قبل یہ پرندہ مجھے زخمی حالت میں سمندر کے کنارے ملا تھا۔ خون بازوؤں سے بہہ کر اس کے پنجوں تک آپہنچا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کی تیمارداری کی، اُسے نرم نرم اناج پکا کر کھلایا اور اُسے گرم اور آرام دہ بستر مہیّا کیا۔
اب اُس کے زخم مندمل ہو چکے ہیں۔
"تم دو روز سے میرے ساتھ ہو، اس عرصے میں کیوں نہیں بولے؟"
سچ مانو تو کہوں... تمہاری دل آویز شخصیت نے مجھے

متاثر کر رکھا تھا۔ حلق سے آواز ہی نہیں نکلتی تھی۔"
"تو پھر اب کیوں بولے؟ میرے متعلق کیا تمہارا خیال بدل چکا ہے؟"
"نہیں، یہ بات نہیں"۔ پرندہ گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے، پھر کہتا ہے:
"بات دراصل یہ ہے کہ مجھے آج ہی سفر پر روانہ ہونا ہے"۔
"اتنی تیز ہوائیں، ایسی گہری شام کو؟"
"ہوائیں تیز بھی ہیں اور شام بہت گہری۔ مگر میری زندگی میں اس سے بھی کڑا وقت آچکا ہے... اس سے بھاری شام آئی ہے، ان سے بھی تیز ہوائیں چلی ہیں"۔
جانے کیوں میں اداس ہو جاتی ہوں۔
"لیکن یہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہیں"۔
پرندہ کہتا ہے:
"خطرناک؟ ہاں میرے حق میں یہ ہوائیں خطرناک ہو سکتی ہیں لیکن جی جان کا خطرہ کب نہیں اور کہاں نہیں؟ شاید تمہیں یہ جان کر حیرت ہو کہ مجھے طوفانی رات اور بھری برسات میں سفر کرتے ہوئے بڑا لطف آتا ہے"۔
میں خفگی سے کہتی ہوں۔
"لطف؟ کاہے کا لطف... جب جان جوکھوں میں

پڑتی ہو۔۔۔"

پرندہ کہتا ہے :

"ہوائیں میری اڑان کی سمتیں بدلتی ہیں، برسات پروں کو تر کرکے بھاری کر دیتی ہے۔ سیاہی مجھے اندھا کر دیتی ہے لیکن میں اپنے وجدان کے سہارے اپنے حوصلوں کی معرفت سفر کرتا ہوں۔ مُہم جوئی اور معرکہ آرائی میں مجھے نامعلوم سی مسرت ہوتی ہے۔ میں نے ایسے متعدد سفر کئے ہیں۔"

یہ کہتے کہتے وہ اپنی ننھی منی آنکھوں سے مسکرانے لگتا ہے۔

بجلی چمکتی ہے، بند کھڑکی تیزی سے کھل جاتی ہے۔ سرد ہوا کا جھونکا سمندر کی لہر کی مانند اندر آتا ہے۔ میں جھٹ سے اُٹھ کر کھڑکی بند کر دیتی ہوں۔

پرندہ پھُدک کر فرش پر آجاتا ہے۔ دو ایک بار وہ اپنے پر کھول کھول کر سمیٹتا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ اس کے پَروں پر موم اور موتی کا سا ملمع چڑھا ہوا ہے اور ان کی نقرئی سطح پر سرخی سی نظر آرہی ہے۔

"تو میں چلوں ۔"

پرندہ اپنے پاکیزہ بازوؤں کو میرے سر پر رکھ کر انتہائی شفقت سے کہتا ہے۔

میں گردن جھکائے ہوئے سوچ رہی ہوں ۔ ۔ ۔ میں کس قدر اکیلی تھی ۔ ایسے ماحول میں میری حیثیت گویا کسی بے مصرف شئے کی سی تھی ۔ یہ پرندہ نہ جانے کن سمتوں سے اڑتا ہوا آیا ۔ ۔ ۔ دو روز میرے ساتھ رہا ۔ ۔ ۔ اور اب اپنی جدائی کا صدمہ دیے جارہا ہے ۔ کاش ! آج بھی یہ خاموش ہی رہتا ، چپ چاپ آیا تھا ، چپ چاپ چلا جاتا ، لیکن اس نے تو کلام کیا ہے !

" میں جانتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہی ہو ۔"

" آں ۔ ۔ ۔ " میں اپنے خیالوں سے لوٹ آتی ہوں ۔

" میں تم سے بات کیے بنا ہی رخصت ہو سکتا تھا ، تمہیں کبھی علم ہی نہ ہو پاتا کہ میں بولنے والا پرندہ ہوں ۔ لیکن تمہاری روشنی اور حرارت نے مجھے مجبور کیا کہ میں تم سے چند باتیں کروں ۔"

یہ کہہ کر پرندہ خاموش ہو جاتا ہے ۔

" اچھا ۔ ۔ ۔ وقت بہت ہو چکا ۔ دیکھو آسمان بالکل سیاہ ہو گیا ہے ۔"

ہم مکان سے باہر آجاتے ہیں ۔ سرد ہواییں نئی پیدا ہو چکی ہے ۔ میں جدائی کے کرب اور ماحول کی قاتلانہ سنگینی سے کانپنے لگتی ہوں ۔ لیکن جلد ہی اپنے آپ پر قابو پالیتی

ہوں ۔ پھر مجھے پرندے کے دشوار سفر کا بھی خیال آتا ہے۔
پرندہ دو چار بار زور زور سے اپنے پر پھڑپھڑاتا ہے۔
"الوداع ... الوداع"
"اَل ... وِ ... داع" لفظ ادا نہیں ہو پاتا مجھ سے۔
پرندہ بازو پھیلائے نیچی اڑان بھرتا ہوا چند لمحوں میں سطحِ سمندر پر پہنچ جاتا ہے، پھر اس کا وجود روشن ہو جاتا ہے، گویا اس کی پُشت پر کوئی چاند اتر آیا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ اوپر اور اوپر اٹھتا چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی نے مجھے کھدر کی چادر میں گٹھری کر دیا ہو۔

خواب میں چند ایسے واضح اشارے تھے جن کی بنیاد پر شریفی اُن کی شخصیت کا تجزیہ کر چکے تھے۔ جس چکرویو میں وہ داخل ہو چکی تھیں اس سے باہر نکل آنا ان کے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ البتہ آٹو سجیشنز کے ذریعے شریفی انہیں حالات سے سمجھوتا کر لینے اور ندامت کے شدید احساس سے یقیناً چھٹکارا دلا سکتے تھے۔ اس خیال سے انہوں نے بیگم فردوس کو اگلے روز کا اپائنٹمنٹ دے دیا تھا۔ اس روز وہ نہیں آئیں۔ شریفی نے سمجھا کہ گھریلو مصروفیات کی بنا پر وہ نہ آئی ہوں اگلے روز آجائیں گی۔ خلاف توقع وہ اگلے روز بھی نہیں آئیں۔

اس واقعے کو مہینوں گزر چکے ہیں ، لیکن وہ نہیں آئیں .

ایک روز شریفی اپنی کلینک میں بیٹھے ڈاک دیکھ رہے تھے کہ اپنے نام آئے ہوئے متعدد خطوں میں بیگم فردوس کا خط پاکر حیران ہوئے۔ عالمِ حیرانی میں انہوں نے لفافہ چاک کیا۔ لکھا تھا :

شرمندہ ہوں کہ ایک عرصے کے بعد آپ سے رجوع ہو رہی ہوں شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے کیس میں دل چسپی لی ، اور میری جانب خصوصی توجہ فرمائی۔ ممکن ہے یہ سن کر آپ کو حیرت ہو کہ جس روز میں آپ کو اپنے خواب کا مسودہ دے گئی تھی اس روز کے بعد ایک مدت تک مجھے وہ خواب نہیں آیا۔ لیکن اب ، چند ہفتوں سے وہ خواب ہر دوسرے تیسرے آنے لگا ہے۔ اور میری کیفیت پہلے سے زیادہ ابتر ہو جایا کرتی ہے۔ مزید یہ کہ اب وہ خواب محض پرندے کی روانگی تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ ایک واقعے کے اضافے کے بعد ایک المیہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ میں پرندے کی روانگی کے سیکوینس
میں دیکھتی ہوں کہ :

تاریکی کی سرنگ سے چند دراز قد سائے طلوع ہوتے ہیں اور میرے اطراف یوں منڈلاتے ہیں گویا انہیں کسی اہم چیز کی تلاش ہو ان میں سے ایک کی نگاہ افق میں

اٹھ جاتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ روشن پرندہ لمحہ بہ لمحہ
دور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہ چیخ کر اپنے ساتھیوں کی توجہ
پرندے کی جانب مبذول کرتا ہے۔ پلک جھپکتے ہی ان میں
سے ایک سایہ کسی وزنی آلے کو اپنے شانے پر رکھتا
ہے، ایک زانو فرش پر ٹیک کر نشست باندھتا ہے۔
دوسرے ہی لمحے اس آلے کے دہانے سے ایک گرج کے
ساتھ بارود اگل پڑتی ہے۔ چند ثانیوں بعد پرندے کا
روشن وجود بجھ کے رہ جاتا ہے۔ مارے دہشت کے
میری ہچکی بندھ جاتی ہے۔ چند لمحوں بعد وہ سائے پھر
اسی تاریکی کی سرنگ میں غایب ہو جاتے ہیں۔

شریفی کے ہاتھوں میں بیگم فردوس کا خط بدستور موجود تھا۔ وہ
سوچ رہے تھے کہ بیگم فردوس کے خواب کی تعبیر انہوں نے جن نفسیاتی
اصولوں کی بنیاد پر کی تھی، اب وہ تعبیر اس واقعے کی بنا پر غلط ثابت ہو
رہی تھی۔ چنانچہ اب وہ اس خواب کی عمارت میں ایک نئے دروازے
سے داخل ہونے کے امکانات پر غور کر رہے تھے۔

اِنکی کے سُپرد

پا پیادہ سفر کرتے کرتے ہمارے جوتوں کے ٹانکے اُدھڑ چکے تھے اور جسم تھکن سے نڈھال تھے ۔ شام رات کے قالب میں اُتر رہی تھی اور شب خون مارنے والے درندوں کے ہیولے دِلوں پر ہجوم کرنے لگے تھے ہماری بچی ہمارے آگے آگے چل رہی تھی ۔ اور غالباً ہماری ذہنی و جسمانی کیفیتوں سے لاتعلق تھی ۔ ممکن ہے اس ماحول میں اُس کی دلی کیفیت ہم سے مختلف رہی ہو ۔ اور اس کے ذہن میں بجائے خوف و ہراس پیدا ہونے کے خوش گوار تاثرات مرتب ہو رہے ہوں ۔ لہٰذا وہ گنگنانے لگی ۔

اگر دِن ڈوب چُکا ہے ۔ اگر چڑیوں کا گانا بند ہو چکا ہے ،
اگر ہوا تھک کر سُست پڑ گئی ہے ،
تو مجھ پر بھی تاریکی کی دبیز چادر ڈال دے ،
جس طرح تو نے زمین کو نیند کی چادر میں لپیٹ دیا ہے ۔

"اور جس طرح تو نے اپنی نرم انگلیوں سے شام کے وقت جھکتے ہوئے، کنول کی پنکھڑیوں کو آہستہ سے بند کر دیا ہے،
اس مسافر سے جس کا توشہ خالی ہو چکا ہے،
جو گرد و غبار سے اٹ چکا ہے،
سکت ختم ہو چکی ہے،
تو اس کی نکبت کو دُور فرما اور اسے شرمندگی سے بچالے،
رات کے ساز گار پردے میں!
ایک پھُول کی طرح اس کی زندگی کو پھر سے نیا کر دے۔"

اُسے کئی گیت، نظمیں اور مناجاتیں ازبر تھیں۔ وہ موقع بے موقع انھیں گنگنایا کرتی تھی۔ اس کی ہلکی اور مدھر آواز میں یہ حمد سُن کر میرے جسم میں توانائی پیدا ہوئی، کچھ ایسی ہی کیفیت میری بیوی کی بھی ہوئی۔ اس کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ ہماری بوجھل رفتار اب قدرے سُبک ہو گئی۔

کچھ دیر بعد بچی نے پوچھا:

"بابا ہم کہاں جا رہے ہیں"؟

"رِینا جا رہے ہیں بیٹے، بڑا خوب صورت شہر ہے۔"

"ہم نے سدّوم کیوں چھوڑ دیا؟"

"دانہ پانی اُٹھ گیا تھا ہمارا ــــــ پریشانیاں بڑھ گئی تھیں ــــــ رِینا میں سُکھ چین سے رہیں گے۔"

"شہر ہی میں کیوں بابا، کسی قصبے یا گاؤں میں کیوں نہیں؟"
بیٹا شہر علم و حکمت، صنعت و حرفت، تجارت اور سیاست کا مرکز ہوتا ہے۔ شہر انسان کے عقل و شعور کا اُفق وسیع کرتا ہے۔ اُسے جینے کے قرینے اور زندگی سے لُطف اندوز ہونے کے سلیقے سکھاتا ہے۔"
"آپ سچ کہہ رہے ہیں بابا!! کیا شہر انسان کو متمدن اور مہذب بناتا ہے؟"
یہ سُن کر میری سوچ کی کل بند ہو گئی۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔
"آپ چپ کیوں ہیں بابا؟ ... کیا کوئی غلط سوال پوچھ لیا ہے میں نے؟"
"نہیں بیٹے یہ بات نہیں۔ مجھے ایک کتھا یاد آ گئی، پوری تو یاد نہیں رہی۔ ادھوری ہی سُن لو:

"آنو نے پاکیزہ مقامات پر
پانچ شہر بسائے۔
اور ان کو نام دیئے
اُن میں آنو نے عبادت کے مرکز بھی قائم کیے۔
پہلا شہر اَریدو تھا۔
انو نے اُسے پانی کے دیوتا
انکی کے حوالے کیا ...."

وہ توجہ سے کتھا سنتی رہی۔ میرے خاموش ہو جانے پر کچھ دیر کے بعد بولی: "بابا! یہ انکی کون تھا؟"

میں نے جواب دیا :

"انکی بھی دیوتا تھا، اَنو جانتا تھا کہ اِنکی اُس کی حفاظت کر سکتا ہے ۔ دنیا کے اکثر بڑے شہر پانی کے کنارے کنارے ہی آباد ہوئے تھے ۔ اب اُن میں سے کئی نیست و نابود ہو چکے ہیں ۔"

"شہر نیست و نابود ہو چکے ہیں ؟ یہ کیوں کر ممکن ہے ۔ ؟"

"بیٹے وہ واقعی نابود ہوئے یہاں تک کہ ان کے آثار بھی سطح زمین سے معدوم ہو گئے ۔ اس بات کو یوں سمجھو کہ پانی کی نمی اور پانی کے نمک نے شہروں کو اندر ہی اندر کھا کر کھوکھلا کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ شہروں کو سیل و سیم سے محفوظ رکھنا چاہیئے ۔ یہ اُن کے حق میں مضر ہوتے ہیں ۔"

اب وہ میری بات سُن کر چپ ہو گئی ۔ مجھے یقین تھا کہ میری باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آئیں ۔ کچھ دیر بعد وہ فرطِ مسرت سے چیخی !

"دیکھو بابا !! ادھر ۔ ۔ ۔ ۔ وہ روشنی ۔"

اس کی کانپتی ہوئی انگلی کی سیدھ میں میں نے دیکھا ۔ واقعی وہاں روشنی ہو رہی تھی ۔

میری بیوی بولی ۔

"مجھے تو کسی دیئے کی روشنی معلوم ہوتی ہے ۔ اللہ کرے کوئی سرائے ہو جہاں رات بسر کی جا سکے ۔"

میں نے کہا ۔

"خدا پر بھروسہ رکھو۔ مسافروں کی رہنمائی کے لیے جس کسی نے بھی دیا روشن کیا ہے۔ وہ ان کی شب بسری کا سامان بھی کرتا ہوگا۔"

آدھے گھنٹے بعد ہم ایک خستہ حال مکان کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ دِیا جو ہمیں اس فاصلے سے نظر آیا تھا، مکان کے برآمدے میں جل رہا تھا۔ مدّھم روشنی میں ہم نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کوئی ذی رُوح نظر نہ آیا۔

میں نے آواز دی۔

"کوئی ہے، مسافروں کی خبر گیری کرنے والا؟"

کسی نے لبیک نہ کہا۔

کچھ دیر ٹھہر کر میں نے پھر آواز دی۔

چند ثانیوں کے بعد سفید لبادہ اوڑھے ایک شخص کمرے سے نکلا۔ میں نے اس مدھم روشنی میں دیکھا، اس کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ اور سر پہ صافہ۔ غالباً اپنی عبادت مکمّل کیے بنا ہی وہ اپنے حجرے سے باہر آیا تھا۔

"ہم مسافر ہیں۔ بستی سدوم سے آرہے ہیں۔ اور وادی رینا کو جارہے ہیں۔ مستورات ساتھ ہیں۔ آپ کو زحمت نہ ہو اور آپ کی اجازت ہو — تو ہم اسی برآمدے میں رات گزار دیں۔ صبح ہوتے ہی اپنی منزل کو روانہ ہو جائیں گے۔" اس نے دونوں ہاتھ کے اشارے سے ہمیں تسلی دی بڑھ کر ہمارے سر پر سے سامانِ سفر اتارا۔ ہمیں برآمدے کے ایک کونے میں

نِچھی نواڑ کی چارپائی پر جو اُس مدھم روشنی میں پہلے نظر نہ آئی تھی، بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر اندر چلا گیا۔

ہم اُس کی انسان دوستی اور خدا ترسی کے رویے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ میری بیوی نے اُسے دُعائیں دیں۔ بچّی اس ماحول میں مسرور نظر آنے لگے۔

کچھ دیر کے بعد جب وہ باہر آیا، تو اس کے ایک ہاتھ میں قِندیل تھی اس نے اشارے سے مجھے اپنے پیچھے آنے کی ہدایت کی۔ وہ ایک کنویں کے پاس جاکر رُک گیا۔ کنویں کی مینڈ پر ڈول رکھا ہؤا تھا۔ اس نے اشارے سے مجھے ہاتھ منہ دھوکر تازہ دم ہو جانے کو کہا۔ پھر خود اندر چلا گیا،

تقریباً آدھے گھنٹے میں ہم تینوں سفر کی گرد سے پاک ہو چکے تھے۔ ہمارے اعضاء کو بھی تھکن سے راحت مل چکی تھی۔ بس بھوک کا غلبہ بڑھ چلا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ شخص کمرے سے باہر آیا۔ اب وہ اپنا صافہ اتار چکا تھا۔ اس کے سر کا زیادہ حصہّ چمک رہا تھا۔ سر کے حاشیے پر مختصر سے بال تھے۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح بھی نہ تھی۔ غالباً اس کی عبادت مکمل ہو چکی تھی۔ اس نے شفقت سے ہم تینوں کے سر پر باری باری ہاتھ رکھا۔ اور صحت وسلامتی کی دُعائیں دیں۔

پھر بولا:

"آپ سے تفصیل سے باتیں پھر ہوں گی۔ پہلے آپ کچھ تناول فرمالیں۔"

قدرے روشن کمرے کے وسط میں دستر خوان بچھا ہوا تھا۔ ڈلیا میں رکھی ہوئی گرم گرم روٹیوں سے سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ زیتون کا آچار مرتبان میں تھا اور تازہ تازہ سبزیاں سلیقے سے کٹی ہوئی قابوں میں رکھی ہوئی تھیں۔

جب ہم نے اُسے بھی، اپنے ساتھ شریک ہونے کو کہا۔ تو وہ بولا:

"میں دِن میں تھوڑا سا میوہ کھا لیا کرتا ہوں۔ رات کا کھانا پچھلے چالیس سالوں سے موقوف کر رکھا ہے۔"

میری بیٹی نے وجہ معلوم کی۔ تو وہ بولا:

"بدن میں کسل مندی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور روح بوجھل! عبادت اور ریاضت دونوں میں خلل پڑتا ہے۔"

کھانا کھا چکنے کے بعد میری بیوی اور بیٹی نے مل کر دستر خوان بڑھا دیا اور ہر چیز صاف کر کے قرینے سے رسوئی میں رکھ دی۔

کچھ دیر بعد ہم اُسی کمرے میں قہوے کے پیالے لئے بیٹھے تھے اور بات چیت جاری تھی۔ اُس نے پوچھا:

اب یہ بتایئے، کہ آپ نے وادی سینا کے سفر کا قصد کیوں کیا؟

میری بیوی بولی:

"ہماری یہ مسافرت دراصل ہماری ہجرت ہے۔ ہمیں سدوم میں

سکون قلب نصیب نہ تھا۔ بستی میں آئے دن فساد ہوا کرتے تھے۔
قتل اور چوری کی وارداتیں، زنا، اور جادو کا عمل آٹھوں پہر ہوا کرتا تھا۔

سدومی ہم سے عدو کا معاملہ رکھتے تھے اور بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں میں لحاظ کیے بنا، انھیں یکساں مصائب میں مبتلا کرتے تھے۔

سود خوری اور ایذار سانی ان کی فطرت ثانیہ تھی ـــــ مظلومی اور ذلت ہمارا مقدر بن چکی تھی۔ ہم نے برسوں ان کا جبر سہا۔ ان کے عذاب کی سیاہی میں ہم نے بے شمار جوہر کھوئے۔ آپ عابد بھی ہیں اور زاہد بھی آپ عالمِ اسباب اور عالمِ غیب دونوں کا علم رکھتے ہیں۔ آپ سے آخر کیا پوشیدہ!"

یہ کہہ کر میری بیوی خاموش ہو گئی۔ اب وہ اپنی سوچ کی کسی گہری قبر میں جھانکنے لگی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ بولی:

"اب رہنا جائیں گے اور بچی کچھی زندگی کاٹ دیں گے۔"

اس شخص کے چہرے پر حزن و ملال کی کیفیت طاری ہوئی۔ اس نے دونوں بازو اپنے سینے پر یوں سمیٹ لیے گویا اُسے اچانک سردی کا احساس ہوا ہو۔ اس نے دھیرے دھیرے ہم تینوں کا جائزہ لیا۔

پھر کچھ دیر بعد بولا:

"انتہائی دُکھ کے ساتھ کہتا ہوں کہ وادیِ رینا میں بھی آفات سماوی آفاتِ ارضی اور آفاتِ انسانی کا اژدہام ہے۔ میں اس وادی سے کوسوں دور ہوں۔ اس کے باوجود مجھے راتوں کو اس وادی سے بین و بکا۔ آہ وفغاں کی صدائیں سُنائی دیتی ہیں۔ اب رینا میں وہ پہلے کے سے دن نہ رہے۔ اب نہ تو وہاں سے بربط کی جھنکار سُنائی دیتی ہے اور نہ دف کی دھڑکن پر کوئی نغمہ الاپتا ہے۔ نہ تو سوداگروں کے قافلے اُدھر سے آتے ہیں اور نہ کسی بھولے بھٹکے مسافر سے وہاں کے ساکنوں کی آسودہ حالی یا خیر و سلامتی کا پتا چلتا ہے۔"

وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا پھر بولا:

"کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں شہر آشوب لکھا جا رہا ہو۔"

وہ پھر خاموش ہو گیا۔

اس نیم روشن کمرے میں خاموشی ٹھنڈک کی صورت میں اُتر آئی۔

کچھ دیر بعد وہ گویا ہوا۔ انداز ہم کلامی کا سا تھا۔

"میں بذاتِ خود فانی ہوں، لیکن ذاتِ حق کے ساتھ باقی ہوں۔ خواہشات سے منہ موڑ کر میں نے حقائقِ ربانی سے ناتا جوڑ لیا ہے۔ اسی لئے اس ویرانے میں آباد ہوں؛ نہ تو سدوم کی حدود میں ہوں۔ نہ رینا کے علاقے میں۔ نہ سبا کے دائرہ اختیار میں ہوں، نہ نصرت کے رسُوخ میں۔ اس کے باوجود میں اس جبر کا شاکی ہوں۔ جس کے آپ ہیں۔ انھیں مظالم کا شکار ہو چکا ہوں کہ جن کے آپ۔ اس ویرانے میں بھی ویسی ہی آفتیں اور بلائیں

منڈلایا کرتی ہیں۔ جیسی آپ کے شہر میں!

آپ ایک شہر میں بستے ہیں۔ لیکن ایک شہر میرے اندر آباد ہے۔

آپ سدّوم چھوڑ کر رہنا جا رہے ہیں۔ میں اپنا شہر چھوڑ کر کہاں جاؤں:

اس جملے پر گویا اُس کے خیالات کا سلسلہ آگے بڑھنے سے رُک گیا۔

وہ ہمیں خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میری بیٹی دم بخود میرے پہلو سے آ لگی۔

میں نے آہستہ سے کہا:

"ہم شرمندہ ہیں کہ ہم نے، نہ تو آپ کے حالات معلوم کیے اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی کہ آپ پر کیا گزری ہے؟"

میری بات سُن کر اس کے لبوں پر خفیف سی طنزیہ مسکراہٹ پیدا ہوئی اور پلک جھپکتے میں معدوم ہو گئی۔

وہ بولا:

"سو ڈیڑھ سو سال پہلے میرے بڑے دادا، اپنے قبیلے کے ساتھ پہاڑوں سے اُتر کر یہاں بس گئے۔ قبیلہ دو ڈھائی سو نفوس پر مشتمل تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ قدرتی وسائل میں کمی واقع ہونے لگی۔ نتیجے میں خانہ جنگیاں ہونے لگیں۔ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں قبیلے والے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ جو بچ گئے۔ ان میں کبھی بھائی چارگی، امن و سلامتی کا جذبہ پیدا نہ ہو سکا۔ ایک دن ایسا بھی آیا کہ میرے بھائی۔ میری بہنیں، میری بیوی، میرے بچے آپس کی دشمنی کا شکار ہو گئے۔

اپنے قبیلے کا نام لیوا بس میں بچ رہا ہوں ۔"
یہ کہتے کہتے اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔
کچھ دیر بعد وہ پھر گویا ہؤا۔ انداز خود کلامی کا سا تھا:
"میں اپنے ماضی میں آباد ہوں۔ میرے مستقبل کا راستہ اندھیرے غار کو جاتا ہے۔ زندگی کا ہر لمحہ کسی خندق کی کگر میں ختم ہوتا ہے۔ اپنی زندگی سے آپ مایوس نہ ہوں۔ آپ کی بیوی بچّی دونوں سلامت ہیں۔ اپنی بچّی کے مستقبل سے آپ اپنی تمام تر امیدیں وابستہ کر سکتے ہیں۔ خدا پر بھروسا رکھیں۔ کل صبح پھر ہم حالات کا جائزہ لیں گے۔ یہاں سے صرف رینا کو ہی راستہ نہیں جاتا۔ یہاں سے کئی اور بستیوں کو بھی راہیں پھوٹتی ہیں۔ آپ کا مقصد بہرصورت پُرسکون زندگی گزارنا ہے۔"
یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔
منزل پھر سراب بن چکی تھی۔
کچھ دیر بعد وہ ہمیں خواب گاہ میں چھوڑ کر رخصت ہوا۔ چراغ ٹھنڈا کرنے کے بعد جب ہم اپنے اپنے بستروں پر لیٹے تو انجان بستی کی بیگانی آفتوں کا خوف بستی سدوم کی آفات کی طرح ہمارے دلوں پر طاری ہونے لگا
کچھ دیر تک یہی کیفیت رہی۔ میں جامد و ساکت پڑا تھا کہ میری بیٹی نے میرے گالوں کو سہلاتے ہوئے پوچھا:
"بابا! حمد سو گئے؟"
"ہاں! ایک بے معنی سا لفظ میرے لبوں سے نکلا۔

"بابا سناؤں "۔ اس نے اندھیرے میں میرے سینے پر اپنے نازک ہاتھوں سے زور دے کر اصرار کیا۔

"اچھا سُناؤ، پر دھیرے سے "

"وہ لیٹے لیٹے گنگنانے لگی؛

"اے خدا! میں شکر گذاری کی آواز بلند کروں

تیری سچائی کی راہ پر چلتا رہوں۔

تیرے جلال وجمال کے خیموں کو عزیز رکھوں

اے خدا؛ تو اپنی رحمتوں اور شفقتوں کے طفیل

میری جان کی حفاظت فرما۔

اپنی ہری بھری چراگاہوں میں

اور راحت کے چشموں کے پاس پہنچنے کا موقع عنایت فرما۔

اپنے عصا اور اپنی لاٹھی سے مجھے تسلی دے "

حمد ختم ہوئی تو اس نے دوسری سُنائی۔ جب دوسری ختم ہوئی تو اس نے تیسری سُنائی۔ غرض کہ اس کی آواز بڑی دیر تک میرے کانوں میں رَس گھولتی رہی۔ میں پچاس سالہ بوڑھا اپنی کم سن بچی سے حیات وکائنات کے رموز واشارات سمجھتا رہا۔

اور جب دریچوں سے صبح صادق کے آثار نظر آنے لگے۔ تو ہم نے سامانِ سفر باندھا۔ ناشتہ کیا۔ اور اس بزرگ سے بڑے احترام اور انتہائی عقیدت سے رخصت لے کر سفر پہ روانہ ہوئے۔

اور جب ہم کھلے میدان میں پہنچے۔ تو بچی باآوازِ بلند گانے لگی:
"میرے رخصت کے اس موقع پر مجھے خوش قسمت رہنے کی دعا دو۔
اے میرے دوستو!
آسمان پر سرخیٔ طلوع نمودار ہو چکی ہے۔
اور میری روشن راہ میرے سامنے ہے۔
میرا سفر جب پورا ہوگا۔
شام کا تارا نکل آئے گا۔"
وہ گیت مکمل کر چکی تو میں نے بیوی سے کہا۔
"اپنا اپنا ہوتا ہے۔ پرایا پرایا... ہم نے سب کچھ کھو دیا تو کیا مضائقہ، ہماری بچی نے تو بہت کچھ پایا ہے۔
میری بیوی نے اثبات میں گردن ہلائی پھر بولی۔
"اس بزرگ کی سرگزشت بھی کتنی سبق آموز ہے۔"
میں نے اس کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا:
"تم ٹھیک کہتی ہو۔ انھوں نے اپنا ماجرہ سنا کر ہماری مشکل آسان کر دی۔"
وہ بولی:
"تب ہی انھوں نے رخصت کے وقت یہ نہ پوچھا کہ ہم کسی رخ جا رہے ہیں؟"
میں نے کہا:

"گویا انھیں یقین ہو کہ ہم نے فیصلہ اُنھی کی مرضی کے مطابق کیا ہے؟"

وہ بولی:

"سچ ہے، یہ اللہ والے غیب کی خبر رکھتے ہیں"

"بابا! ادھر کدھر!"

بچّی کی آواز حیرت و مسرّت سے سرشار تھی۔

اسے جواب دینے کے بجائے، میں اپنی بیوی سے مخاطب ہوا:

"کیا اسے نہیں معلوم؟ جس طرح اُنھوں نے آریدو اِنکی کے سپرد کیا تھا، اُسی طرح ہم بھی اپنا شہر اس کے حوالے کرنے جا رہے ہیں"

(افسانے میں شامل کتھا۔ نظم۔ حمد اور گیت، رگ وید، زبور، اور گیتانجلی سے ماخوذ ہیں۔)

Will there be art and
Poetry in dark days?

Yes, there will be art
And poetry of dark days.

Bertolt Brecht

مصنف کی دیگر مطبوعات

۱۔ چاندنی کے سپرد (افسانے)

مطبوعہ سنہ ۱۹۷۸ء

۲۔ چوپال میں سنا ہوا قصہ (افسانے)

مطبوعہ سنہ ۱۹۸۴ء

۳۔ رات کا پرندہ (ناول)

زیرِ تکمیل